جہدِ مسلسل

(بہاول پور براستہ گورکھ پور)

سوانح انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب (تمغۂ امتیاز)

تحریر و تحقیق

پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد

ڈاکٹر محمد آصف ندیم

مشاورت

زاہد علی خان

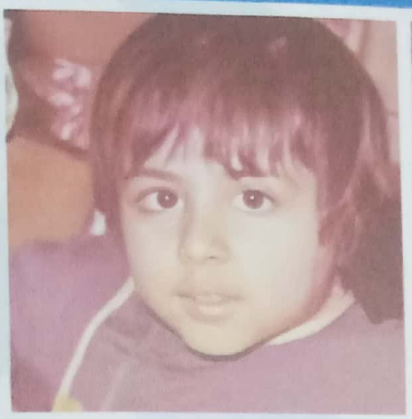

DHA SUFFA UNIVERSITY

جہدِ مسلسل

(بہاول پور براستہ گورکھ پور)

سوانح انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب (تمغۂ امتیاز)

تحریر و تحقیق

پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد

ڈاکٹر محمد آصف ندیم

مشاورت

زاہد علی خان

تمام جملہ حقوق بحقِ مصنفین محفوظ ہیں۔کتاب ہذا کا کوئی بھی حوالہ یا حصّہ بلا اجازت مصنفین، نہ ہی نقل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی الیکٹرانک یا پرنٹ میڈیا میں شائع کیا جا سکتا ہے۔

قانونی مشیر: ملک نیاز احمد ایڈووکیٹ
(ایم اے، ایل ایل بی، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

سال اشاعت: 2022ء

کمپوزنگ: احمد ندیم

آڈیو ریکارڈنگ و معاونت: اُسامہ شہزاد

ناشر: ڈائریکٹوریٹ آف کمیونٹی براڈکاسٹنگ ریڈیو، ٹی وی اینڈ فلم

نام کتاب: جُہدِ مسلسل (بہاول پور براستہ گورکھ پور)
سوانح - انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب

تحریر و تحقیق: پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد
ڈاکٹر محمد آصف ندیم

مشاورت: زاہد علی خان

سرِ ورق: مزمل مقبول

اشاعت: اوّل

تعداد: 500

مطبع: کتاب نگر، خاور سنٹر نصرت روڈ ملتان کینٹ
0321-4510444

قیمت: -/1500 روپے

انتساب

اُن حریّت پسند مجاہدوں، ماؤں اور بہنوں کے نام
جنہوں نے
تحریکِ پاکستان میں لازوال
قربانیاں دیں!

فہرست عنوانات

-1	پیش لفظ	7
-2	ابتدائیہ	11
-3	باب اول پاکستان کیوں نہ بنتا؟	19
-4	باب دوئم ہجرت وَجہِ وَصل بھی بنتی ہے!	41
-5	باب سوئم یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے	45
-6	باب چہارم پدرم سلطان بود	55
	☆ ..... قاضی محمود الحق	63
	☆ ..... قاضی اظہر محبوب	64
	☆ ..... انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب	64
	☆ ..... شازیہ محبوب	65
	☆ ..... شہلا محبوب	66
	☆ ..... رابعہ اطہر زوجہ اطہر محبوب	66
-7	باب پنجم بہاول پور	69
-8	باب ششم رئیس الجامعہ انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب (تمغہ امتیاز)	75
-9	باب ہفتم جامعہ اسلامیہ بہاول پور	97
-10	باب ہشتم میرِ کارواں، دانائے رموز؛ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلرز کا اجمالی تعارف	101

۱۔	پروفیسر ڈاکٹر ابوبکر غزنوی	101
۲۔	پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	103
۳۔	پروفیسر ڈاکٹر عبدالقیوم قریشی	105
۴۔	پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد	107
۵۔	پروفیسر ڈاکٹر ذوالفقار ملک	109
۶۔	پروفیسر ڈاکٹر مصباح العین خان	111
۷۔	پروفیسر ڈاکٹر بلال سکھیرا	113
۸۔	پروفیسر ڈاکٹر شفیق خان	114
۹۔	پروفیسر ڈاکٹر منیر اختر	116
۱۰۔	ڈاکٹر بلال اے خان	118
۱۱۔	پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار	120
۱۲۔	پروفیسر ڈاکٹر سلیم طارق	122
۱۳۔	پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل	123
۱۴۔	پروفیسر ڈاکٹر قیصر مشتاق	124
۱۵۔	پروفیسر ڈاکٹر عامر اعجاز	125
۱۶۔	انجنیئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب (تمغہ امتیاز)	126
11-	باب نہم اس کے آئینہ ہستی میں، عمل جوہر تھا! تمغۂ امتیاز	127
12-	باب دہم کوئی قابل ہو تو ہم شان نئی دیتے ہیں! پی ایچ ڈی	137
13-	باب گیارہ رہبر، ہمدم وغم خوار، استاد ہیں قوم کے معمار	155
14-	روشن اقدام	177
15-	کتابیات	180

پیش لفظ

تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان اُس قانونِ فطرت کی تفسیر ہے کہ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے۔ صدیوں کی غلامی سے نجات یا آزاد پاکستان کیسے وجود میں آیا اور قائدِ اعظم کی بے لوث قیادت، پھر عظیم قائد کے جانثاروں کا ذکرِ خیر اس کتاب کا مرکز و محور ہے اور اس گلستانِ آرزو کی چہکار انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور ہیں۔

یہ کتاب "بہاول پور براستہ گورکھ پور" داستان ہے، ماضی، حال اور مستقبل کے زینوں پر جلتے بجھتے چراغوں کی کہ جنہوں نے حرفِ اظہار کے راستوں کو منزل آشنا کیا۔ اپنی قوم کے مشاہیر کے کارناموں کی آب و تاب ماضی کے جھروکوں سے نکال کر حال کے تناظر میں دیکھنے کا عمل جہاں دل کش و دل فریب ہے وہیں عظمتِ رفتہ کو نوجوان نسل کے سامنے پیش کرنا اور قیامِ پاکستان سے پہلے کے حالات قلم بند کرنا ہمارے لیے ایک کارِ خیر سے کم نہیں۔ یہ وہ آزادی کے متوالے تھے جو قائدِ اعظم محمد علی جناح کے گرد مثلِ پروانہ رہے اور جن کی خاموش قربانیاں تاریخ کی دھند میں کہیں کھو گئیں، انہیں بیان کر کے ایسا لگا کہ جیسے کوئی کارِ خیر انجام دیا ہو۔

حیاتِ اِنساں ہے، شمعِ صورت، ابھی روشن، ابھی افسردہ
نہ جانے کتنے چراغ یوں ہی جلا کریں گے، بجھا کریں گے

''یہ ڈیڑھ صدی کا قصّہ ہے'' پل دو پل کی بات نہیں۔ اس کتاب میں بیان کردہ واقعات ان دو خانوادوں کی مستند تاریخ ہے جنہوں نے ہجرت کی تکالیف برداشت کیں۔ اپنا گھر بار، شان و شوکت اور مقام و مرتبہ کو پیچھے چھوڑ کر اُس خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جو آج اسلامی جمہوریہ پاکستان کی صورت میں دنیا کے نقشہ پر موجود ہے۔ یہ اُن کے ہجر و وصل کی داستان ہے جن پر قائدِ اعظم محمد علی جناح کا بے انتہا اعتبار ہی وہ وجہ بنی کہ جس کی بدولت وہ آل انڈیا کانگریس چھوڑ کر آل انڈیا مسلم لیگ میں نہ صرف شامل ہوئے بلکہ انہوں نے تحریک پاکستان کے لئے خود کو وقف بھی کر دیا۔ ان اسلاف کے جاہ و حشم کی داستانیں گورکھ پور (ہندوستان) میں آج بھی موجود ہیں۔ ان کے رہائشی محلّات اور قائم کردہ کُتب خانے گورکھ پور نیز قابلِ قدر علمی کام کتابی شکل میں آج بھی علی گڑھ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اُن کی فیّاضی اور سخاوت کے قصّے کئی نسلوں سے گورکھ پور میں سنائے جاتے ہیں اور گورکھ پور کے لوگ آج بھی ان خانوادوں کی خدمات کو فراموش نہیں کر سکے۔ وہ گورکھ پور سے تو ہجرت کر آئے مگر ان کی انسان دوستی، حسنِ سلوک اور سادگی گورکھ پور کے عوام کے دلوں سے ہجرت نہ کر پائی۔ یہ خانوادے ہجر و وصل کی صعوبتیں جھیلنے اور کانگریسی نفرتوں کو سمیٹنے کے بعد جب پاکستان آئے تو ایک بار پھر اس ملک کی خدمت اور یہاں کے لوگوں کی بہتری میں مصروف ہو گئے۔ انھیں سیاسی پیشکشیں ہوئیں مگر فہم و فراست سے بھر پور یہ بزرگ اپنی انا پر ڈٹے رہے اور اس ملک سے انھوں نے کچھ نہیں مانگا ورنہ جو ریاست وہ ہندوستان میں چھوڑ کر آئے تھے نواب لیاقت علی خان و دیگر سیاسی قائدین اس سے واقف تھے مگر اس خاندان نے پاکستان میں نہ تو عملی سیاست میں حصّہ لیا نہ ہی کوئی زمین یا رقبے الاٹ کروائے بلکہ ایک سادہ سی زندگی اور اس ملک سے وفاداری کو نصب العین بنایا۔ یہ خاندان گورکھ پور سے آ کر کراچی میں رہائش پذیر ہوا اور کراچی سے ان کی نسلوں نے نواب بہاول خان اوّل کی بسائی ہوئی بستی رانجھے خان، موجودہ بہاول پور کا رخ کیا اور یوں گورکھ پور سے بہاول پور کا سفر تا حال جاری و ساری ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ

خاندان بہاول پور پہنچ کر اپنے اصل کی طرف لوٹ آیا ہو جہاں سے ان کے آباء نے سفر کیا تھا اور ہجرت کی یہ طویل داستان ابھی تھمی نہیں صرف ایک وقفہ آیا ہو اور یہ سفر ابھی جاری ہو۔ یہ خاندان پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لیے آج بھی کوشاں ہے اور اپنے اسلاف سے اس ملک کی خدمت کے وعدے کو عملی طور پر نبھا رہے ہیں۔

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

جُہدِ مسلسل - بہاول پور براستہ گورکھ پور عنوان کے تحت یہ کتاب یا ہماری یہ کاوش آپ کے زیرِ مطالعہ ہے جس میں حال سے ماضی کی جانب ایک طویل سفر کو مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے اور کوشش رہی کہ کوئی بھی ایسا واقعہ شامل نہ ہو جس کی سند کمزور یا محض سنی سنائی بات ہو۔ اس کتاب سے متعلق تمام ضروری حوالہ جات مستند اسناد کے ساتھ اس کتاب میں شامل ہیں۔ ہمارا مقصد مستقبل کے لئے ملک و قوم کو ایک ایسا پختہ راستہ فراہم کرنا ہے جس پر چل کر ہم اپنے اسلاف کی عظمتوں، ان کے کارناموں اور ان کی شجاعت و بہادری کو پڑھ کر اپنے حال و مستقبل کا لائحہ عمل تیّار کر لیں اور ایک قوم کے طور پر یکجا ہو کر نئی تاریخ رقم کریں تا کہ آنیوالی نسلیں بھی ہمیں ویسے یاد رکھیں جیسے ہم اپنے اسلاف پر فخر کرتے ہیں:

رقص جن کا ہمیں ساحل سے بھگا لایا تھا
وہ بھنور آنکھ تک آئے تو کنارے نکلے

زاہد علی خان
ڈاکٹر محمد شہزاد (پروفیسر، شعبہ میڈیا سٹڈیز)
گلی نمبر 15 غربی، پیپلز کالونی ماڈل ٹاؤن بی، بہاول پور
ڈاکٹر محمد آصف ندیم (ایسوی ایٹ پروفیسر، شعبہ ایجوکیشن)
گلی نمبر 4 شاداب کالونی، بہاول پور

ابتدائیہ

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

کنفیوشس نے کہا تھا کہ اگر مستقبل کو سنوارنا ہے تو ماضی (تاریخ) کا مطالعہ کرو۔اس جدید دور میں جہاں سرحدیں سمٹ کر گلوبل ویلج بن گئیں جہاں مختلف ثقافتی آمیزشوں کی بات کی جاتی ہے اور ملّت وقومیّت کے لفظوں کو بوسیدہ وفرسودہ قرار دیا جا رہا ہے ایسے ماحول میں جہاں ہماری نوجوان نسل یک سر سوشل میڈیا اور اس پر جاری پراپیگنڈہ کا شکار ہو رہی ہے، یہ کتاب اسلاف کی عظمتوں اور ماضی کو یاد کرنے کیلئے تحریر کی گئی ہے ۔جس کا مقصد دوقومی نظریہ کا احیاء اور آزادی کے متوالوں اور ان کی نسلوں کے احسان مند رہنے کا وقت ہے۔ شاید یہ وقت انتہائی مناسب ہے کہ اپنے شان دار ماضی کے ہیروز کو خراجِ عقیدت پیش کیا جائے اور نوجوان نسل کو پھر بتایا جائے کہ یہ ملک ایک نظریہ کی بنیاد پر حاصل کیا گیا اور اس کے حصول کے لئے کیسی کیسی قربانیاں دی گئیں۔ ماہ و سال کی تقویم میں یہ نئی نسل پروان چڑھی ہے اور ماحول میں بہت سی تبدیلیاں بھی آ چکی ہیں۔منفی پراپیگنڈہ کی یلغار نے تعمیری سوچ کو بہت متاثر کیا ہے۔ کوئی سرد آہ بھر کے کہتا ہے کہ

ع.....منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

اور کوئی یوں رقم طراز ہے:

دیئے باغبان بن کے بلبل کو دھوکے
بہاریں جو آئیں چمن بیچ ڈالا

آج مغربیت پسندی میں مبتلا والدین کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ وہ حریت کی یہ داستانیں اپنی اولادوں کو بیان کریں۔فکرِ معاش کے دباؤ میں وہ خود بھول گئے ہیں کہ پاکستان کس قدر قربانیوں سے حاصل کیا گیا تھااور اس کے حصول کے لئے بلکہ پورے ہندوستان کو آزاد کرانے کیلئے جتنی قربانیاں مسلم راہ نماؤں نے دیں اس سے زیادہ دیگر مذاہب کے قائدین نے نہیں دیں۔ تاریخ کا مطالعہ کر لیں برِصغیر میں ما سوائے گاندھی کے کسی دوسرے مذہب کا لیڈر آپ کو نہیں ملے گا جس کا قد کاٹھ مسلم راہ نماؤں کے برابر ہو، وجہ بہت واضح ہے کہ انگریزوں کی سب سے زیادہ مزاحمت مسلمانوں نے کی کیونکہ انگریز مسلمان حکمرانوں کا تختہ الٹ کر آئے تھے۔خود انگریز بھی اس حقیقت سے واقف تھے کہ اگر کوئی سر اٹھا کر ان کے سامنے کھڑا ہوسکتا ہے تو وہ مسلمان ہی ہیں اسی لئے انگریزوں کی ہر پالیسی مسلم دشمنی پر مبنی رہی۔مسلمانوں کے سینہ میں حریت کی جو لو دھیمی دھیمی سلگ رہی تھی قائد اعظم کی قیادت میں وہ ایک الاؤ بن کر سامنے آئی اور انگریزوں کا یہ خدشہ درست ثابت ہوا کہ مسلمان ایک دن انہیں برّصغیر سے نکال کر ہی دم لیں گے۔ پاکستان صرف ایک مملکت کا حصول نہیں تھا بلکہ یہ اس بات کا بھی غماز تھا کہ مسلمان حریت پسند ہوتا ہے کوئی اسے غلام نہیں بنا سکتا۔ برّصغیر کے مسلمانوں نے آزاد وطن کے لئے جتنی تکلیفیں جھیلیں یا مصائب اٹھائے ان کو لکھتے ہوئے آج بھی قلم کانپ جاتا ہے۔ ہجرت ایک نیک عمل ہے لیکن کسی ہجرت کرنے والے سے پوچھ کر تو دیکھیئے کہ اپنے باپ دادا کی قبروں کو چھوڑ کر نئی منزلوں کی طرف جانا کیسا ہوتا ہے۔ایک اَن دیکھی منزل کا جنون بن جانا کیا خود ایک معجزہ نہیں؟ قربانی کی جتنی بھی قسمیں ہیں حصولِ پاکستان کی کوششوں میں وہ تمام قربانیاں مسلمانوں نے پیش کیں۔ یہ کتاب اُن لوگوں

کے جذبہ کو سلام پیش کرنے اور نئی نسل کو یہ بتانے کے لئے لکھی گئی ہے کہ تمہارے اسلاف ہی اصل ہیرو ہیں۔ مغربی متکلمین اور فلسفی تمہاری منزل نہیں ہو سکتے۔ ہمارے راہ نما پیارے نبی ﷺ اور پھر ان کی تعلیمات کو آگے لے کر چلنے والے ہمارے سلف صالحین اور تحریکِ پاکستان کے قائدین ہیں۔ یہ کتاب نئی نسل کو یہی بات سمجھانے کے لئے لکھی گئی ہے کہ اسلاف کے راستہ کو چھوڑنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی تناور درخت کی شاخیں کاٹ دی جائیں۔ ذرا سوچئے بغیر جڑ کے درخت کی بقا کب تک ہے۔اس کتاب میں نئی نسل کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مولوی سبحان اللہ اور محمد رضوان فقط ڈاکٹر اطہر محبوب کے اجداد نہیں ہیں وہ اس قوم کے معمار بھی ہیں جہاں جہاں اس کتاب میں مولوی سبحان اللہ اور محمد رضوان کا ذکر ہے آپ سر سید احمد خان، مولانا الطاف حسین حالی، چراغ حسن حسرت، پیر جماعت علی شاہ، جوہر برادران، علامہ اقبال، رائے احمد نواز کھرل، نظام لوہار اور ان بے شمار وسنہرے کرداروں کے طور پر پڑھیں گے جو جان تک قربان کر گئے مگر آپ ان کی قربانیوں سے آج بھی واقف نہیں ہیں ان کی قربانی کے نتیجہ میں بننے والے آزاد ملک کی سرزمین پر آپ سانس تو لے رہے ہیں مگر انہیں یاد کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس کتاب میں وقت کی طنابیں اس لئے کھینچی گئیں ہیں کہ آج کی نسل کو مولوی سبحان اللہ اور محمد رضوان سے براہِ راست ملوایا جائے اور وہ ان کے عکس ثانی ڈاکٹر اطہر محبوب سے بھی متعارف ہوں۔ اس کتاب میں وہ فاصلے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے جو نئی نسل اور اکابرین کے درمیان پیدا ہو چلے ہیں۔اگر آپ کو ہماری یہ کاوش پسند آئے تو آپ ہماری ان باتوں کو پھیلانے کی کوشش کیجئے گا۔

زور اور مخالفت انگریزوں کو مسلمانوں سے برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس لئے آزادیٔ ہند کی تاریخ میں مسلم راہنماؤں کا قد کاٹھ بے حد بلند اور ارفع ہے۔ یہاں تک کہ پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور گاندھی جیسے غیر مسلم راہ نما بھی مسلمانوں کی قربانیوں کا ذکر بڑے ہی واشگاف انداز میں کرتے تھے اور ان کی قربانیوں کو

ستائش کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے بعد ہندو قائدین نے ہمیشہ ہی مسلمان راہنماؤں کے حوالہ سے تاریخ مسخ کرنے یا تاریخی حقیقتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا تا کہ کسی طرح سے تاریخ میں رقم آزادی ہند میں مسلمانوں کی ناقابلِ فراموش قربانیوں کو مٹا کر تاریخ کو بدلا جائے ان کی اس گھناؤنی سوچ کے رد میں پاکستان میں کی جانے والی کوششیں اونٹ کے منہ میں زیرہ کے برابر ہیں اور ہم نے دیکھا ہے کہ ہندو سازشی ذہن ہم سے ہمارے بنگالی بھائیوں کو اسی پراپیگنڈا کی بنیاد پر الگ کر چکا ہے جس کا سب سے زیادہ نقصان دو قومی نظریہ کو پہنچا:

احساس مر نہ جائے تو انساں کے لیے
کافی ہے ایک راہ کی ٹھوکر لگی ہوئی

ہماری نوجوان نسل ہر سال چودہ اگست کی آزادی کی خوشی تو خوب مناتی ہے مگر یہ احساس موجود نہیں کہ آزادی ایسے ہی نہیں ملی اس کی قدر اور حفاظت کرنا ضروری ہے۔ آج جو فرقہ واریت کی آگ آزادی کے اس دیپ کے گرد منڈلا رہی ہے وہ رفتہ رفتہ ہماری قومیّت اور نظریہ کو بجھا بھی سکتی ہے۔ جس طرح افواجِ پاکستان پر حملوں کا سلسلہ جاری ہے اور جس طرح ہمارے فوجی جوانوں کی شہادتوں اور قربانیوں کو یک سر نظر انداز کیا جا رہا ہے اس سے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے سیاسی قائدین احساسِ قومیّت سے عاری ہو چکے ہیں ۔ ہم مسلمانوں کے عزم و استقلال سے انگریز اور ہندو دونوں ہی خائف تھے اور یہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب سب مسلمان حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار متحد تھے اور آج پھر ہمیں اس اتحاد کی ضرورت ہے ۔ کوئی بھی گروہ ہو، کوئی بھی ادارہ ہو یا کوئی بھی عنصر ہو وہ یہ بات سمجھ لے کہ ہم پاکستانی مشکل وقت میں متحد ہو کر جنگ لڑنا جانتے ہیں اور ان جھوٹے سہاروں کی ضرورت مسلمانوں کو نہیں۔ کیوں کہ ہماری قومیّت کا محور و مرکز نظریہ اسلام ہے جو آفاقی ہے:

فریب کھایا ہم نے غلط سہاروں کا!

انہی قائدین کی نسل در نسل قربانیوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے کیوں کہ حبّ الوطنی ان کے خون میں اور وطن پرستی ان کی تربیّت میں شامل ہے۔ ان کی موجودہ نسل اس ملک کو مضبوط اور پائے دار عمارت کی تشکیل میں اپنا کردار بہ خوبی نبھا رہے ہیں۔ وہ قوم کی تعمیر، تشکیل، ترقی ونشوونما میں تعلیمی سربراہ کے طور پر اس قومی تعمیرِ نو یعنی نوجوانانِ پاکستان کے نظامِ تعلیم کو جدید خطوط پر استوار کر رہا ہے یوں اس کتاب میں ماضی سے حال کو جوڑ دیا گیا ہے اور ان تمام نسلوں کے متعلق آگہی کی فراہمی کے لیئے اس خاندان کے متعلق معلومات کی فراہمی سے لیکر دیگر آگہی قریبی دوستوں اور واقفانِ حال سے معلومات کے لئے مختلف اوقات میں ملاقاتیں اور رابطہ کر کے باوثوق ذرائع سے معلومات کو اکٹھا کرنے کے بعد یہ اوراق مرتب کیے گئے ہیں۔ تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے حوالہ سے اس کاوش کو سراہا جائے گا۔ چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ اس کی تصویر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کی ذاتِ گرامی رہی۔ ان کی گفتگو اور ہر نشست ایک کتاب کی وسعت لیے ہوتی ہے۔ ان کی منصبی فرائض کی مصروفیات، کانفرنسوں کا انعقاد، بیرونِ ملک اسفار، کچھ اور مصروفیات میں انہوں نے جو وقت ارزاں کیا اور تحریکِ پاکستان میں جاں نثاروں اور قائداعظم کے مخلص ساتھیوں اور مسلم لیگ پشتیبانوں پر جس انداز سے روشنی ڈالی یقیناً تاریخِ پاکستان میں علم وعمل کے ابواب ہیں۔ انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب تحریر میں بوئے گُل، تقریر میں نالۂ دل اور ایسی شخصیت کے سامنے تیشۂ فرہاد بھی خاموش ہو جاتا ہے اور الفاظ کو تصویری بانکپن مل جاتا ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

اس خاندان کے موجودہ فرد انجنیئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب پاکستان کے لیئے خدمات کے صلّہ میں تمغہ امتیاز جیسے اعزاز سے نوازے جا چکے ہیں، جو اس بات کا

اعتراف ہے کہ پاکستان اور اسلام کے لیئے اس خاندان نے اپنا اسلوب نہیں بدلا اور تاحال پاکستان اور اس کے دفاع کو ناقابلِ تسخیر بنانے کے عمل میں سرگرداں ہیں، جو اپنے بزرگوں کی طرح اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر اس ملک اور اس کے مستقبل کی خاطر قربانیاں دینے کی مثال پر قائم ہیں۔ وہ فی الوقت جامعہ اسلامیہ کے کم عمر ترین وائس چانسلر ہیں اور انہوں نے اس سے قبل دو یونیورسٹیوں کی بنیاد و تشکیل کی جس میں ڈی ایچ اے صفا یونیورسٹی کراچی اور خواجہ فرید یونیورسٹی رحیم یار خان شامل ہیں اور اب جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں نظامِ تعلیم میں بنیادی اور انقلابی تبدیلیوں کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ اب تک دو سال میں انتہائی اہم تبدیلیاں اس جامعہ میں لا چکے ہیں اور ان کے انقلابی اقدامات سے یونیورسٹی میں داخلوں کے نظام سے لے کر اساتذہ کی بہتری تک ایک شان دار تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے اقدامات سے نہ صرف یونیورسٹی دن دوگنی رات چوگنی ترقی پا رہی ہے بلکہ بہتر رینکنگ کی طرف رو بہ عمل ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کے والدِ محترم بھی افواجِ پاکستان سے ریٹائر ہوئے اور انھوں نے دو جنگوں میں حصّہ لیا اور بہادری و شجاعت کے ساتھ ساتھ، انھوں نے پاک فضائیہ کے کئی پائلٹس کی تربیّت بھی کی۔

اس کتاب کو خاص طور پر نوجوانانِ پاکستان کو پڑھنا چاہیئے تاکہ وہ اپنے اسلاف کی تاریخ اور قیامِ پاکستان میں دی گئی قربانیوں کا مطالعہ کریں اور ہندو پراپیگنڈہ اور تاریخی تحریفات سے چوکنّا ہوکر رہیں اور ہندوؤں کو فخر سے یہ بتا سکیں کہ ہندوستان کی آزادی میں سب سے بڑا کردار مسلمانوں کا تھا اور انڈیا، سری لنکا، برما کی آزادی بھی انہی مسلمان راہ نماؤں کی مرہونِ منت تھی جو قربانیاں نہ دیتے تو شاید برّصغیر آج بھی برطانوی تسلّط میں ہوتا یا ہم سب ہندوؤں کے غلام ہوتے۔

الحمدللہ! آج مسلمانانِ ہند کی اپنی سرزمین ہے اور ہم آزادی کی سانس لے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ قائدِ اعظم و دیگر مسلم قائدین کا شکریہ، نواب آف بہاول پور سر صادق محمد خان عبّاسی پنجم (V) کا شکریہ کہ انہوں نے اپنی ریاست کے الحاق کے علاوہ

نوزائیدہ پاکستان کو تمام تر لاجسٹک سہولیات مہیّا کیں اور اس ملک کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔ ان کا تعلیمی وژن تھا جس نے جامعہ اسلامیہ بہاول پور جیسی عظیم درسگاہ کا قیام عمل میں لایا اور ان کی علم دوستی کی بدولت یہ خطہ گل و گلزار ہو پایا۔ گرچہ ہمارا موجودہ طرزِ عمل اس شعر کے مصداق ہے، یوں ترقی کے نئے ابواب کھلتے جا رہے ہیں:

ٹھہرے اگر تو منزلِ مقصود پھر کہاں
ساغر بکف گرے تو سنبھلنا نہ چاہیے

باب اول

پاکستان کیوں نہ بنتا؟

بولی اَمّاں محمد علی کی ۔۔۔۔۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو!

مؤرخین تقسیمِ ہند کی بہت سی وجوہات بیان کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے طویل دورِ حکومت کے اسباب کو عقیدہ، زبان اور ثقافت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تاہم تحریک خلافت کے دوران مہاتما گاندھی کی جانب سے ایک واقعہ پر منفی ردِّ عمل، مسلمانوں کیلئے غیر متوقع تھا اور یہی واقعہ ہندو مسلم اتحاد کے خاتمہ کا سبب بنا۔ ایسے میں تحریکِ خلافت برّصغیر کے مسلمانوں کے لیئے جذبات سے زیادہ ایک مذہبی مسئلہ بن چکی تھی ۔ یہ تحریک برّصغیر کے مختلف شہروں میں ہندو اور مسلمانوں نے مل کر چلائی اور اس تاریخی واقعہ کا نقطۂ عروج بھارت کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش کے مشہور شہر گورکھ پور کے نزدیک موجود ایک قصبے چوری چورا میں 4 فروری 1920ء کو مولوی سبحان اللہ کی قیادت میں مسلمانوں کے احتجاج کے دوران پیش آیا۔

یہ واقعہ انگریز کی نظر میں 1857ء کی طرح غدّاری کا ایک واقعہ تھا، درحقیقت یہ برّصغیر کی آزادی کیلئے جدو جہد کرنے والے محبِ وطن عوام کی ایک روشن مثال ہے۔ جس کے ہیرو مولوی سبحان اللہ ہیں، جو گورکھ پور ڈسٹرکٹ کانگریس اور جمعیّت علماء ہند کے صدر تھے۔

1920ء میں برصغیر کو انگریزوں سے آزاد کرانے کیلئے عدم تعاون کی تحریک

شروع کی گئی جس میں برّ صغیر کے عوام سے غیر ملکی اشیاء کے مکمل بائیکاٹ کی اپیل کی گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی، یو پی کے شہر گورکھ پور میں عوام نے مقامی کانگریسی راہنما مولوی سبحان اللہ کی قیادت میں بھرپور احتجاج کرتے ہوئے غیرملکی اشیاء کا بائیکاٹ کر دیا۔ مقامی پولیس نے مظاہرین کے خلاف اس وقت سخت کاروائیاں کیں جب وہ چوری چورا کے قصبہ میں غیر ملکی شراب کی دکان کے باہر مظاہرہ کر رہے تھے۔ ہجوم کو منتشر کرنے کے لیئے مقامی پولیس نے اس پر لاٹھی چارج کیا۔عوام نے مشتعل ہو کر قریبی تھانہ پر حملہ کر کے اسے نذرِ آتش کر دیا اور یوں سانحہ چوری چورا وقوع پذیر ہوا۔

اس واقعہ میں پُر امن مظاہرین پر پولیس نے حملہ کیا جس کے ردّ عمل میں انہوں نے برطانوی پولیس کی ایک چوکی کو نذر آتش کر دیا۔ اس آتش زدگی میں 22 پولیس اہلکار زندہ جل گئے۔ تاریخ میں یہ واقعہ ''سانحہ چوری چورا'' کے نام سے رقم ہے۔

مولوی سبحان اللہ گورکھ پور کے رہائشی تھے اور ان کا شمار اتر پردیش ریاست کے اہم کانگریسی راہنماؤں میں ہوتا تھا ان دنوں مولوی سبحان اللہ کا تعلق مہاتما گاندھی سے انتہائی قریبی تھا، ان کے متعلق گاندھی جی نے عوامی سطح پر 1921ء میں گورکھ پور آمد کے موقع پر کہا تھا کہ مولوی سبحان اللہ جیسے دو اور سیاسی راہنما اگر کانگریس کو مِل جائیں تو برصغیر کی آزادی کا خواب بہت جلد شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔تحریک عدم تعاون کے دوران مولوی سبحان اللہ کی تقاریر نے گورکھ پور اور اس کے گردونواح کے عوام ایسا جذبہ اور ولولہ پیدا کر دیا کہ 1857ء کی یاد تازہ کر کے رکھ دی۔ جنگِ آزادی میں جوش وخروش اور ولولۂ تازہ پیدا کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ 1857ء کی تاریخ گورکھ پور میں دہرائی جانے والی ہے۔

حریّت پسندی کا یہ باب چوری چورا کے ناقابلِ فراموش واقع کی صورت میں رونما ہوا جس نے جنگِ آزادی کا رخ بدل دیا اور تاریخ کے اس دھارے کو موڑنے والی

شخصیت مولوی سبحان اللہ تھے۔اس سونامی نے برطانوی حکومت کے تن آور درخت کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا۔

مولوی سبحان اللہ ،خاندانی رئیس اور علاقہ کے متمّول زمین دار تھے ، دولت کی ریل پیل کے باوجود عاجزی و انکساری ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے۔عوامی، سیاسی و سماجی حلقوں میں مولوی سبحان اللہ ایک انتہائی معتبر، منکسر المزاجی نیز عاجزی اور مقبول حیثیت کے حامل تھے۔ چوری چورا کے واقعہ نے انہیں مسلمانوں میں ہر دل عزیز بنا دیا۔ دوسری جانب انتہائی شدید عوامی ردّ عمل نے انگریز حکومت کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

برطانوی سامراجی قوتوں نے مولوی سبحان اللہ کی گرفتاری کے سخت احکامات جاری کر دیے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گاندھی جی اور کانگریس اپنے راہنما اور کارکن کی حمایت میں سامنے آتے ، الٹا گاندھی جی نے واقعہ میں تشدد کے عنصر کو یک سر مسترد کرتے ہوئے فوری طور پر تحریکِ عدم تعاون کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔گاندھی جی کے اس فیصلہ کو کانگریس میں بھی سخت ناپسند کیا گیا۔ یہاں تک کہ گوّا (Gova) کانگریس میں رام پرساد بسمل اور ان کے ساتھیوں نے گاندھی جی کے خلاف اس قدر سخت احتجاج کیا کہ کانگریس دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ برطانوی حکومت نے اس موقع کو غنیمت جان کر تبلیغ اور شدّھی سنگھٹن کا جادو جگا دیا۔ بنارس میں بابا خلیل داس کے تبلیغی جلوس نکلنے لگے اور دہلی میں سوامی شردھ آنند کی زبان درازیاں شروع ہو گئیں۔

گورکھ پور کا کلکٹر شہر اور ضلع میں مولوی سبحان اللہ کے اثر و رسوخ سے واقف تھا۔ اس نے انہیں گرفتار کرنے یا ان کے خلاف مقدمہ چلانے کے بجائے انہیں سمجھایا اور کہا کہ آپ کن لوگوں پر تکیہ کئے ہوئے ہیں۔ اگر اپنی بریّت چاہتے ہیں تو بیان دے دیجئے کہ میں Non Cooperator نہیں ہوں۔ مولوی سبحان اللہ کو گاندھی جی کے طرز عمل نے پہلے ہی بد دل کر دیا تھا لہٰذا انھوں نے بیان دے کر کانگریس اور جمعیت العلماء دونوں سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے خاکسار تحریک

میں شامل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی سبحان اللہ دونوں نے ہی اسی مسئلہ پر یو پی کی صوبائی کانگریس کی نائب صدارت سے بھی استعفیٰ دے دیا۔

مولوی سبحان اللہ اپنی امیرانہ عیش پسندی کے باوجود انتہائی مخیّر، ہمدرد اور دوست نواز انسان تھے۔ قومی ہمدردی کا جذبہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ ضرورت کے وقت لوگوں کی ہر طرح کی مدد کو تیّار رہتے تھے۔ ان کی فراخ دلی کے قصّے آج بھی گورکھ پور اور اس کے نواح میں مشہور ہیں۔

اس طرح گاندھی جی کا مخالف گروپ، مولوی سبحان اللہ اور ان کے ساتھیوں کی حمایت میں سرگرم ہو گیا جس سبب گاندھی جی کی طرف سے پیش کی جانے والی تحریک (عوامی سول نافرمانی) کو ہی نقصان نہ پہنچا بل کہ وہاں کے مسلمان، کانگریسی راہنماؤں سے بھی بدظن ہو گئے۔ نتیجتاً ہندو مسلم اتحاد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور دو قومی نظریہ کو تقوّیت حاصل ہوئی۔ جس کے بعد انگریز حکومت اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود مولوی سبحان اللہ کو گرفتار نہ کر سکی جب کہ چوری چورا سانحہ کے ٹھیک اٹھارہ دن بعد گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا اور انھوں نے دو سال تک اسی تحریک کی پاداش میں جیل کاٹی۔

(بحوالہ Dart.colambia.edu)

مولوی سبحان اللہ ایک علم دوست انسان تھے۔ ان کی علم دوستی کی ایک مثال آج بھی علی گڑھ یونیورسٹی میں چار ہزار قلمی نسخوں کی صورت میں موجود ہے۔ یہ نسخہ جات علی گڑھ یونیورسٹی کی لائبریری میں ان کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں۔ ان نسخوں میں اہم ترین کتابوں کی فہارس درج ہے جو محققین کے لئے مشعل راہ ہیں۔ چوری چورا کے واقعہ نے مولوی سبحان اللہ کا ذہن یوں بدلا کہ وہ کانگریس چھوڑ کر قائد اعظم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ برّصغیر کی اس اہم سیاسی و سماجی شخصیت مولوی سبحان اللہ کی وفات 1920ء میں ہوئی۔ وفات کے وقت آپ کے پانچ بیٹے، سیّد محمد رضوان اللہ، سیّد محمد عرفان اللہ، سیّد محمد لطف اللہ، سیّد محمد غفران اللہ اور سیّد محمد بارک اللہ تھے

اور سب کے سب کم سن تھے۔ اس موقع پر مولوی سبحان اللہ کے سب سے قریبی دوست اور ہم نشین قاضی منظور الحق نے مولوی سبحان اللہ کے بچوں کی سرپرستی ویسے ہی کی جیسے قاضی منظورالحق کے والد قاضی نعیم الحق نے کی تھی۔ یہ تعلق بعد ازاں دو خاندانوں کا اٹوٹ بندھن بن گیا۔ مولوی سبحان اللہ کے ایک بیٹے سیّد محمد لطف اللہ 1960 میں انسپکٹر جنرل آف پولیس سندھ بھی رہے۔ (React.etvbharat.com)۔

مولوی سبحان اللہ کے بڑے بیٹے سیّد محمد رضوان اللہ بھی اپنے والد کی طرح پر اثر شخصیت کے مالک تھے ان کی ولادت 1900ء میں ہوئی ۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے دوران 1933ء سے 1948ء کی درمیانی مدّت میں ہندوستانی سیاست کے نشیب و فراز اور مسلم لیگ کے عروج کا زمانہ جن لوگوں نے دیکھا وہ یقیناً رضوان اللہ کے نام سے واقف ہوں گے۔ آپ یو پی صوبائی مسلم لیگ کے سیکرٹری، صوبائی مجلس قانون ساز کے نمائندے، یوپی صوبائی پارلیمانی بورڈ کے صدر اور مرکزی دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے اور آپ کا شمار اس دور کے سرکردہ سیاست دانوں میں ہوتا تھا۔ سیّد محمد رضوان اللہ ایک بلند پایہ وکیل اور مشہور سیاستدان تھے۔ ان کا شمار جناح کے قابلِ اعتماد دوستوں میں ہوتا تھا۔ یو پی کے مشرقی اضلاع میں مسلم لیگ کا وجود اور اس کی مقبولیت انھی کی ذات سے وابستہ تھی۔ وہ مسلم لیگی راہنماؤں میں سب سے کم عمر تھے اور 1934ء میں سیاسی میدان میں آئے لیکن اپنی فہم و فراست اور تنظیمی صلاحیتوں کی بدولت صف اوّل کے راہ نماؤں میں شامل ہو گئے۔

سیّد محمد رضوان اللہ کی شخصیّت اور ان کے کارناموں کا جائزہ لینے کیلئے انکا خاندانی پس منظر بیان کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ ان کی تربیّت خالصتاً اسلامی اور سیاسی ماحول میں ہوئی جس کی چھاپ ان کے کردار سے جھلکتی ہے۔

سیّد محمد رضوان اللہ مولوی سبحان اللہ کی دوسری بیوی سے دوسرے بیٹے تھے لیکن ماں، باپ اور بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین اور معاملہ فہم تھے۔ وہ گورکھ پور کے انتہائی

سرکردہ متمول اور مذہبی گھرانے کے فرد تھے۔ ان کے خاندان میں امامت، قیادت اور انگریز بیزاری کئی پشتوں سے چلی آرہی تھی۔ سیّد محمد رضوان اللہ کے جدِّ اعلیٰ، مفتی غلام حضرت، عہدِ شجاع الدولہ میں گورکھ پور کے مفتی کے عہدے پر فائز تھے اور وہ 1857ء کی جنگِ آزادی دیکھے ہوئے تھے۔ مفتی غلام حضرت کی ناچاقی گورکھ پور کے انگریز جوائنٹ مجسٹریٹ مسٹر برڈ سے ہوگئی جس پر وہ اپنے عہدہ سے برطرف کر دیئے گئے۔ ان کے صاحب زادے، مولوی حبیب اللہ نے منصف کا عہدہ انگریز حکام کے اصرار پر اس شرط پر قبول کیا کہ وہ کبھی کافر انگریزوں سے ہاتھ نہیں ملائیں گے۔ وہ ہمیشہ انگریز حکام کو (تم) کہہ کر مخاطب کرتے تھے لیکن انگریز حکام ان کے علم و فضل اور عوام میں غیر معمولی مقبولیت کے پیش نظر ان کا بہت احترام کرتے تھے اور انہیں ہمیشہ آپ کہہ کر مخاطب کرتے رہے۔ مولوی حبیب اللہ کا گورکھ پور کے شہری حلقوں میں ایک خاص مقام تھا۔ وہ ہمیشہ دو شاگردوں کو جنہیں وہ خود عربی پڑھایا کرتے تھے وہ انہیں ساتھ رکھتے اور ان کے اخراجات خود برداشت کرتے تھے۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کے لئے انھوں نے 1868ء میں مدرسہ حبیب الاسلام قائم کیا۔ جس کے لئے محلّہ جعفر بازار میں اپنی حویلی بولیا کے شمالی سرے پر جدید طرز کی ایک عمارت تعمیر کروائی اور اپنی وافر جائیداد سے اس کے اخراجات کے لئے معقول رقم کا انتظام کر کے اس مدرسہ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔ جب صدرالصدور کی حیثیت سے ان کا تبادلہ مرزاپور ہوا تو وہاں بھی انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا اور اس کے اخراجات کیلئے جائیداد خرید کر وقف کر دی۔ یہ مدرسہ اب تک قائم ہے لیکن گورکھ پور کے مدرسہ کو ان کے وارث مولوی سبحان اللہ نے ختم کر کے اس کی عمارت کو جو اپنے رنگ کی نسبت سے پیلی کوٹھی کہی جاتی تھی اپنی رہائش گاہ میں تبدیل کر لیا تھا۔ بعد میں یہی کوٹھی ان کے منجھلے صاحبزادے سیّد محمد رضوان اللہ کی سیاسی اور قومی سرگرمیوں کا مرکز بنی۔

مولوی حبیب اللہ کی اولادوں نے انگریز بیزاری کے جذبہ کو قائم رکھا اور سرکاری

ملازمتیں اختیار کرنے کے بجائے اپنے والد کی وسیع وعریض جائیداد کے انتظام و انصرام میں لگے رہے۔ ان کی اولادوں کی اولاد اور واحد وارث مولوی سبحان اللہ نے برطانوی حکومت کا وہ زرّیں دور پایا تھا جب لوگ نوابی، خان بہادری اور خان صاحبی کا پٹّہ گلے میں لٹکائے حکومت کی خیر خواہی کا دم بھرتے تھے تب مولوی سبحان اللہ گورکھ پور کے رئیس اعظم اور پولو کے شوق میں گورکھ پور کے انگلش کلب کے واحد ہندوستانی ممبر ہونے کے باوجود اپنے آباء کی تقلید اور ان کے بنائے ہوئے اصول وضوابط پر کارفرما رہے اور ہمیشہ انگریزوں کی خوشامد سے گریز کیا بلکہ اکثر انگریزوں سے ان کے تعلقات اتار چڑھاؤ کا شکار رہتے۔ جن کے قصّے آج بھی اس شہر میں مشہور ہیں۔

قدرت نے مولوی سبحان اللہ کو علم، دولت اور جسمانی وجاہت، تینوں صِفّات سے نوازا تھا۔ ان کے گھر پر ملک کے مشاہیر، علماء، شعراء اور ادباء کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ برّصغیر کا شاید ہی کوئی نامور شاعر یا ادیب ہوگا جو انکے دسترخوان پر مہمان نہ بنا ہو۔ مولانا فاخر الہٰ آبادی، ریاض خیرآبادی، جڑ بڑ شاہ وارثی اور حکیم برہم وغیرہ کا روز کا ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان کی علم دوستی اور معارف پروردی کا سب سے بڑا ثبوت وہ کتب خانہ تھا جو اب مولانا آزاد لائبریری، مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کا ایک حصّہ ہے۔ مولوی سبحان اللہ برطانوی حکومت کی دشمنی میں شروع سے ہی کانگریس میں شامل تھے۔ وہ گورکھ پور کانگریس کے ضلعی اور جمعیت العلماء کے صوبائی صدر تھے۔ 1920ء میں گاندھی جی کے فدائیوں میں شامل ہو گئے اور تحریک عدم تعاون میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

سیّد محمد رضوان اللہ کے خاندان کا ایک وصف یہ تھا کہ معاشرتی میل جول میں کبھی طبقاتی فرق کو روا نہیں رکھتے تھے۔ سب کے ساتھ ان کا ملنا جلنا، اکٹھے بیٹھ کر کھانا پینا ان کے ہاں عام دستور تھا۔ لوگوں نے بارہا دیکھا کہ مولوی سبحان اللہ اپنی ٹم ٹم پر جا رہے ہیں اور راستے میں کسی جولاہے نے پکار کر کہہ دیا کہ مولوی صاحب آج گوشت اچھا پکوایا ہے، کھاتے جایئے۔ تو وہ فوراً ہی ٹم ٹم سے اتر جاتے، دالان میں بچھی چارپائی پر اس کے

ساتھ ہی بیٹھ کر بغیر کسی تکلف کے تناول میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اپنے وقت کے نواب اور اس علاقہ کی بااثر شخصیّت ہونے کے باوجود آپ میں تکبّر اور نخوّت چنداں ندارد تھا۔ علاوہ ازیں کوئی سرکاری اہلکار نوکری سے معطل یا برخاست ہو جاتا تو اپنے خاندان کی طویل وعریض حویلی کا کوئی ایک حصّہ اس کی رہائش کے لئے مختص کر دیا جاتا جب تک وہ ملازم اپنی سابقہ ملازمت پر بحال یا کسی دوسری جگہ کام پر نہ لگ جاتا اس کا معقول مشاہرہ باندھ دیا جاتا۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے عوام اس خاندان سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ان کا غیر معمولی احترام کرتے تھے۔ مولوی سبحان اللہ نے اس خاندانی روایت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ ان کی مدد کے لیے کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام مولوی سبحان اللہ پر جان چھڑکتی تھی۔

سیّد محمد رضوان اللہ ایسے ہی خاندان کے فرد اور مولوی سبحان اللہ کے منجھلے صاحب زادے تھے۔ اس تناظر میں اگر سیّد محمد رضوان اللہ کی شخصیّت اور ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ خاندانی فیّاضی، بردباری، انسان دوستی، علاقائی اور ملکی سیاست روزِ اوّل ہی سے ان کے خمیر میں رچ بس چکی تھی۔ انھوں نے جہاں اپنے آباء و اجداد سے ریاست وترکہ وراثت میں پایا، وہاں سیاست کی اعلیٰ صلاحیتیں بھی ان کے حصّہ میں خوب آئیں۔ یہ صلاحیتیں اس امر کی متقاضی تھیں کہ وہ ان کا لوہا مجاہدینِ آزادی اور سیاست دانوں سے منوائیں۔

سیّد محمد رضوان اللہ اور ان کے بھائیوں عرفان اللہ اور غفران اللہ نے 1930ء میں گریجویشن کی ڈگری علیگڑھ یونیورسٹی سے پاس کی۔ رضوان اللہ نے بی ایس سی اور ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد 1931ء میں گورکھ پور میں وکالت کا آغاز کیا ان کے بھائی عرفان اللہ انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے لندن روانہ ہو گئے اور غفران اللہ نے فارمنگ شروع کر دی۔ رضوان اللہ نے کچھ عرصہ بعد وکالت کے پیشہ کو خیرباد کہا اور اپنے خاندانی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے سیاسی عمل میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔ اپنی

سیاسی سرگرمیوں کا آغاز رضوان اللہ نے ڈاکٹر کاٹجو کی شاندار دعوت کے موقع پر مشہور سیاسی راہ نماؤں کی موجودگی میں کیا۔

رضوان اللہ کا پہلا سیاسی معرکہ میونسپل بورڈ کی رکنیّت کے لیے پرانے سٹی فادروں کے خلاف کھڑے ہونے کا تھا مگر سیاسی میدان میں کم تجربہ کے باعث انتخابات میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ تاہم ان کے سیاسی کیریئر کا آغاز ہو چکا تھا چناں چہ اسی عرصہ میں ملک میں کانگریس اور مسلم لیگ کی آویزش شروع ہوگئی۔ گورکھ پور کی مسلم قیادت دو حصّوں میں بٹ گئی ایک طرف گورکھ پور کے با اثر رئیس مولوی حمید اللہ اور ان کے ساتھ جسٹس محمد اسماعیل اور سیّد زاہد علی سبز پوش (ممبر لیجیسلیٹو اسمبلی) تھے وہیں دوسری طرف خان بہادر، مولوی نثار اللہ، محمد فاروق دیوانہ (والد مجنون گورکھ پوری) اور رضوان اللہ تھے جو ان میں سب سے کم عمر تھے کیوں کہ کانگریس سے بیزاری اور شکایت انھیں ورثہ میں ملی تھی اس لیے رضوان اللہ نے مسلم لیگ کا پرچم ہاتھ میں تھاما اور 1936ء میں صوبائی مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس گورکھ پور میں بڑے زور وشور سے کروایا جس میں مسلم لیگ کے تمام قائدین نے شرکت کی اور اس جلسہ کی صدارت لیاقت علی خان نے کی۔ اس کامیاب اجلاس کے بعد رضوان اللہ کی حیثیّت مسلم لیگ میں مستحکم ہوگئی۔

1938ء میں جب صوبائی مجلس قانون ساز کا انتخاب ہوا تو مسلم لیگ کی طرف سے رضوان اللہ نے کانگریسی امیدوار عبدالمجید خواجہ (علی گڑھ) کو شکست دے کر کامیابی حاصل کی اسی طرح سیّد زاہد علی سبز پوش کے مقابلے میں اپنے سیاسی دوست خان بہادر مولوی ثناء اللہ کو کامیاب کروایا۔ گورکھ پور تو رضوان اللہ کا اپنا شہر تھا ہی مگر ان سیاسی فتوحات کے بعد جون پور، غازی پور اور اعظم گڑھ بھی ان کے حلقہء اثر میں آگئے اور یوں مشرقی ہندوستان کی قیادت کا سہرا رضوان اللہ کے سر جاتا ہے۔ سیّد محمد رضوان اللہ، محمد علی جناح کے ساتھیوں میں سے ایک تھے اور جناح صاحب ان سے مسلمانانِ ہند کے مستقبل، سیاسی و سماجی حالات پر ملاقات و مشاورت کرتے رہتے تھے۔ محمد علی جناح اور لیاقت علی

خان کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب جناب خلیق الزّمان سے ناراضی کے بعد یو پی کی سیاست میں قائد اعظم کم و بیش انہی پر انحصار کرنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ 1946ء میں انھوں نے مسلم لیگ کی صوبائی صدارت سے خلیق الزّمان کو ہٹا کر رضوان اللہ کو صدر بنا دیا۔

اس واقعہ کی اصل وجہ یہ تھی کہ جناح، خلیق الزّمان کی بدلتی وفاداریوں سے نالاں تھے اور خلیق الزّمان بھی یو پی مسلم لیگ ونگ پر جناح کی بالا دستی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ بااثر سیاسی قائد تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا اثر و رسوخ مسلم لیگ کی قیادت پر قائم رہے اور لیگی قائدین ان کے مرہونِ منت رہیں اور عوامی رابطہ ان کے ذریعہ رکھا جائے۔ ان کی اس سوچ سے جناح واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ اس طرح مسلم مفادات کو ضرب پڑ سکتی ہے۔

خلیق الزّمان یو پی کے پرانے عوامی لیڈر تھے۔ ان سے قبل مسلم لیگ چند خطاب یافتہ نوابوں، تعلقہ داروں اور بڑے زمینداروں کی جماعت شمار کی جاتی تھی یہ لوگ عوامی خدمات میں محض اسی حد تک دخل دیتے تھے جہاں ان کے مفاد کو ضرب نہ پڑے۔ خلیق الزّمان نے مسلم لیگ کو حقیقی عوامی جماعت بنایا اور اس میں سیاسی سرگرمیاں شروع کر کے نئی روح پھونکی۔ اس لئے یو پی کی حد تک خلیق الزّمان مسلم لیگ پر اپنی گرفت قائم رکھنا چاہتے تھے لیکن جناح بھی اس حقیقت سے بہ خوبی آشنا تھے کہ مسلم لیگ کی قوت کا سرچشمہ یو پی ہی ہے جب تک انھیں یو پی مسلم لیگ پر بالادستی حاصل نہیں ہو جاتی وہ کل ہند پر صدارت نہیں کر سکتے۔ یو پی مسلم لیگ کے بیشتر عمائدین جناح کے ساتھ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دستوری سیاست کی باریکیوں کو صرف جناح ہی سمجھ اور کانگریس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مسلم لیگی حلقوں میں چودھری خلیق الزّمان کو قابلِ بھروسہ نہیں سمجھا جا رہا تھا اس لیے جناح، سید رضوان اللہ پر اپنے اعتماد کا اظہار کرتے رہے اور ہر بار رضوان اللہ ان کی توقعات پر پورا اترے۔ مثال کے طور پر دوسری جنگِ عظیم کے دوران حکومت نے بنکروں

میں سوت تقسیم کرنے کے لئے جو کمیٹی بنائی اس میں کوئی بھی مسلم ممبر نہیں تھا۔ رضوان اللہ نے بمبئی کے گورنر سے ملاقات کی اور احمد داؤد اور سلمان حافظ کو نامزد کروایا۔ اس کے علاوہ فخر الدّین ولیکا کو بھی کوٹہ دلوانے میں کامیاب رہے۔

1946ء میں کانگریسی امیدوار شاہد فاخری کو شکست دے کر وہ دوبارہ صوبائی مجلس قانون ساز کے لیے منتخب ہو گئے اور اپنے تمام ساتھیوں کو بھی کامیاب کروایا۔ جناح نے پاکستان کے نقشے کی تشکیل کے لیے جو چار رکنی کمیٹی بنائی تھی اس میں عبداللہ ہارون، چودھری رحمت علی، پیر علی محمد راشدی کے ساتھ رضوان اللہ بھی شامل تھے۔ اس موقع پر رضوان اللہ نے ایک انگریزی کتابچہ بہ عنوان Seperation And The Corriders Scheme for Paksitan شائع کیا۔

1947ء میں جب دستور ساز اسمبلی قائم ہوئی تو مسلم لیگ کی طرف سے جن سات ممبروں کو منتخب کیا گیا ان میں سے ایک رضوان اللہ بھی تھے۔ بحیثیت ممبر دستور ساز اسمبلی وہ ۶ فیروز شاہ روڈ واقع دہلی میں رہائش پذیر رہے ان کے ساتھ حسرت موہانی بھی قیام پذیر تھے۔

سیّد محمد رضوان اللہ نے عملی سیاست کا آغاز 1930ء سے کیا اور اپنی سیاست کے ابتدائی دور سے ہی وہ آل انڈیا مسلم لیگ سے منسلک ہوگئے۔ رضوان اللہ 1938ء میں یو پی کی صوبائی مسلم لیگ کی کارگذار کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور ان کا شمار بار بار منتخب ہونے والے اراکین میں ہوتا ہے۔ 1941ء میں وہ صوبائی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے عہدہ پر فائز رہے۔ 1945ء میں جب یہ مدت ختم ہوئی تو جناح کی حمایت سے وہ دوبارہ مسلم لیگ کے سیکرٹری منتخب ہوگئے۔

اگرچہ سیّد محمد رضوان اللہ کی سیاسی زندگی کا آغاز مسلم لیگ سے ہوا مگر کانگریسی لیڈروں میں گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر کاٹجو، پنڈت پنت اور رفیع احمد قدوائی سے بھی ان کے تعلقات دوستانہ تھے۔ گاندھی جی ان کی صلاحیتوں کے بہت

معترف تھے۔ حسرت موہانی کو گرویدگی کی حد تک ان سے لگاؤ تھا۔ لکھنؤ اور دہلی میں وہ عموماً ان کے ساتھ قیام کیا کرتے تھے۔ اور ملک کے سیاسی مسائل پر ان کے خیالات اور مشوروں کو غیر معمولی اہمیّت دیتے تھے۔ سیّد محمد رضوان اللہ میں تنظیمی قیادت کی صلاحیتیں خداداد تھیں اور قومی خدمت کا جذبہ انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ دیگر راہنماؤں کی نسبت انھوں نے بہت قلیل مدّت میں ملک کی سیاسی و قومی خدمات میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔ ایک طرف اگر ملک کے سیاستدانوں کو انکی صلاحیّت کا اعتراف تھا تو دوسری جانب سماجی راہنماؤں کو بھی انکی ذات سے کافی توقعات وابستہ تھیں چنانچہ تقسیمِ ہند کے بعد شکاگو سے ڈاکٹر سر محمد ضیاالدّین احمد (سابق وائس چانسلر) مسلم علی گڑھ یونیورسٹی اپنے 13 اکتوبر 1947ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> "امریکہ کے اخباروں میں ہندوستان کے متعلق بہت حالات چھپتے ہیں مگر پاکستان کے متعلق کچھ نہیں چھپتا۔۔۔اس وقت نواب اسماعیل خان، حسرت موہانی، رضوان اللہ، عزیز احمد اور محمد یونس پالیسی بنانے کے اہل ہیں ۔۔۔اور ان کو اس وقت lead دینا چاہئے"۔ (تہذیب الاخلاق علیگڑھ یکم دسمبر 1984ء)

اسی خط کی روشنی میں ہمیں تحریک پاکستان کے اس عظیم مگر گم نام حرّیت پسند رہنما سیّد محمد رضوان اللہ سے آئندہ نسلوں کو متعارف کروانے کا خیال پیدا ہوا تاکہ نوجوان نسل اپنے اسلاف کی عظمتوں کو یاد رکھ سکے اور جان سکے کہ اسلامیہ یونیورسٹی میں قیادت کے فرائض انجام دہی میں مصروف موجودہ انجینئر پروفیسر ڈاکٹر وائس چانسلر اطہر محبوب تحریکِ آزادی کے نامور قائدین کی اولادوں میں سے ہیں۔ اس کاوش سے آزادی ہند کے ایک اور سپاہی کا نام تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو جائے گا۔

گورکھ پور کے واقعہ اور ان کے والدِ گرامی قدر مولوی سبحان اللہ کو دھوکہ ملنے

کے بعد رضوان اللہ جان چکے تھے کہ کانگریس اور گاندھی کسی طور قابلِ اعتبار نہ تھے۔اسی کے پیش نظر وہ ہمیشہ مسلم لیگ کی پاس داری کرتے رہے اور نہ صرف اپنی حد تک ،بل کہ اپنے دوسرے سیاسی مسلم لیگی راہ نماؤں کیلئے بھی راہیں ہموار کرتے رہے ۔ان کے لیے اپنی ذات سے بڑھ کر اپنا مسلم تشخّص اہم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دیگر ہم عصروں سے نمایاں اور جناح کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے کیوں کہ وہ آزادی کے بے لوث، بے غرض اور بے لاگ سپاہی تھے اور مسلم لیگ کی ترقی ،ترویج اور بالادستی کے لیے ہراول دستہ کا کام دیتے تھے۔

اس سیاسی خانوادہ کے نہ صرف مرد، بلکہ خواتین بھی مسلمانانِ ہند کی خدمت اور ان کے سیاسی حقوق کی پاس داری میں پیش پیش رہیں۔ سیّد محمد رضوان اللہ کے چھوٹے بھائی سیّد عرفان اللہ کی زوجہ محترمہ سروری عرفان اللہ بھی تحریک آزادی کی اس جنگ میں شانہ بہ شانہ کھڑی ہوئیں اور مسلم لیگ خواتین ونگ کی قیادت سنبھالی۔ ان کے شوہر سیّد عرفان اللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان اور سرکاری عہدہ پر فائض تھے۔ سیّد عرفان اللہ برطانیہ سے انجنیئر نگ کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اور اس دور میں وہ لکھنؤ کارپوریشن کے چیف انجنیئر تھے۔ شوقِ علوم وفنون اس خاندان کی رگ و پے میں دوڑتا ہے اور سماجی خدمت اس خاندان کا ہمیشہ سے طرّہ امتیاز رہا ہے تقسیم کے بعد سیّد عرفان اللہ جب پاکستان تشریف لائے تو لاہورکارپوریشن کے پہلے انجنیئر کے طور پر اس مملکتِ خداداد میں اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے ۔ بعدازاں کراچی کے چیف انجنیئر بننے کا اعزاز بھی آپ ہی کو حاصل ہوا۔ سیّد عرفان اللہ 1963ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

یوں دس سال کے قلیل عرصہ میں سیّد محمد رضوان اللہ نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سرگرم رکن اور آزادی کے متوالے بن گئے۔ 1937ء میں یہ پراونشل الیکشن گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت گیارہ صوبوں میں منعقد ہوئے جس میں سیّد محمد رضوان اللہ نے حصہ لیا مگر اس وقت مسلمانوں کی سیاسی ناپختگی اور

کانگریس کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ سیّد محمد رضوان اللہ نے United Provinces (یو پی) سے انتخاب لڑا جہاں آل انڈیا مسلم لیگ بری طرح سے ہاری تھی۔ ان United Provinces میں کانگریس نے 133 نشستیں جیتیں جبکہ آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانوں کی مخصوص نشستوں پر صرف 27 حلقوں میں کامیاب ہوسکی۔ بعد ازاں 1946ء کے منعقدہ انتخابات میں سیّد محمد رضوان اللہ انہی United Provinces سے الیکشن لڑے اور کامیاب ہونے والے چھے مسلم قائدین میں سے ایک تھے۔ اس الیکشن میں کانگریس نے 9 فی صد اور آل انڈیا مسلم لیگ نے 87فی صد نشستیں جیتیں۔ اسی الیکشن کے نتائج قیامِ پاکستان کی راہ ہموار کے باعث بنے۔

سیّد محمد رضوان اللہ اس ورکنگ باؤنڈری کمشن (ریڈ کلف کمیشن) کے ممبران میں سے ایک تھے جو برطانوی بادشاہ جارج پنجم کے زیرِ اثر نو آبادیاتی ہندوستان جس کا رقبہ افغانستان سے لے کر تھائی لینڈ تک پھیلا ہوا تھا اور جہاں کی 88 ملیّن آبادی مختلف مذاہب کی پیروکار تھی وہاں پر مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنا تھی۔

سر سائرل ریڈ کلف جو کہ آکسفورڈ میں Professor at British Law تھے انھیں اس کام کے لیے مختص کیا گیا جو قطعی طور پر جغرافیائی تقسیم اور ہندوستان کے سیاسی حالات سے نا بلد تھے۔ وہ اس امر کی انجام دہی کے لیے 8 جولائی 1947ء کو ہندوستان پہنچے۔ گویا برِّصغیر کی تقدیر کا فیصلہ ایک ایسے شخص کے سپرد کیا گیا جو ہندوستان کی تاریخ، تہذیب اور محل وقوع سے یکسر ناواقف تھا۔ طرفہ تماشہ یہ کہ انھیں اتنے بڑے کام کی انجام دہی کے لیے پانچ ہفتوں کا قلیل وقت دیا گیا کہ وہ اس طویل و عریض سر زمینِ ہند کی جغرافیائی تقسیم کر دیں۔ وہ اس سلسلہ میں اپنے آکسفورڈ کے ہم عصر وائسرائے ایرل لوئس ماؤنٹ بیٹن سے ملے اور انھیں بتایا کہ یہ ان کے بس کا روگ نہیں مگر ماؤنٹ بیٹن نے انہیں سختی سے کہا کہ انہیں وائسرائے بنایا ہی اس مقصد لیے گیا ہے کہ وہ اس تقسیم کے عمل کو ممکن کر دکھائیں۔ لہٰذا ریڈ کلف کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ عجلت میں ہندوستان کو

وہاں بسنے والی تین ایسی قوموں میں تقسیم کر دے جو سیاسی طور پر نمایاں تھیں اور باقی اقلیتوں کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ یوں بدھ مت پرستوں کو برما (موجودہ میانمار) کا علاقہ کسی کیک کی طرح کاٹ کر پیش کیا گیا اور مسلمانوں کے حصّہ میں مشرقی و مغربی پاکستان کے ٹکڑے اور باقی ماندہ علاقہ ہندوؤں کو دے دیا گیا جس میں سکھوں کے علاوہ دیگر اقلیتوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔

اس غیر منصفانہ اور عجلت پسندانہ تقسیم کی وجہ سے 11 ملیّن افراد کو ہجرت کی صعوبت برداشت کرنا پڑی اور ان میں سے ایک ملین افراد لقمہ اجل بن گئے کئی خاندان صفحہء ہستی سے مٹ گئے کئی گودیں اجڑ گئیں اور کئی سہاگنیں بیوہ ہوگئیں کیوں کہ تقسیم کا اعلان فوری ہوگیا اور کسی کو سنبھلنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ تقسیم اس قدر غیر منصفانہ تھی کہ ایک گھر کا آدھا حصّہ ہندوستان میں اور دوسرا پاکستان میں آیا تو دوسری طرف آدھا کمرہ ایک طرف اور باقی کا کمرہ دوسری جانب چلا گیا۔

یہ تاریخ کی سب سے بڑی جغرافیائی، مذہبی و سیاسی حماقت تھی جسے آج تک ہندو اور مسلم بھگت رہے ہیں۔ اس کا اندازہ سر ریڈ کلف کو تھا اس لیے انھوں نے اپنے مشاہرہ سے ملنے والی رقم مبلغ 40000 روپے لینے سے انکار کر دیا۔ اس سلسلہ میں آج کے نوجوانوں کو سبق سیکھنا چاہیئے کہ اس ارضِ پاکستان کے حصول میں، قائداعظم و دیگر مسلم قائدین کا کردار قابلِ صد تحسین ہے۔ یہ ان کی سیاسی سمجھ بوجھ اور فہم و فراست تھی جس نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کے خواب کو شرمندہ تعبیر کیا۔ وگرنہ آج جو سلوک سکھوں اور باقی اقلیتوں کے ساتھ ہندوستان میں روا رکھا جا رہا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔

ان تاریخی حقائق کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بھارت کی تقسیم دراصل بنگال اور پنجاب کی تقسیم تھی۔ ان دونوں صوبوں میں مسلم آبادی 55% تھی اور جغرافیائی اعتبار سے ہندو اور مسلم دونوں ان علاقوں کو اپنے ملک کا حصہ بنانا چاہتے تھے

اس کی بڑی وجہ ان علاقوں میں موجود سرسبز فصلات اور صنعتیں تھیں جو کہ ہندو بنیا ہتھیانا چاہتا تھا تا کہ وہ مالی مفادات حاصل کر سکے۔ مسلم لیگ کے لیے یہ علاقے اس لیے اہمیّت کے حامل تھے کہ یہ مسلم اکثریتی آبادی پر مشتمل علاقے تھے۔

برطانوی سامراج تو بنگال میں تقسیم کا عمل 1905ء اور 1911ء میں شروع کر کے اسے دو حصّوں میں بانٹ چکے تھے ایک طرف مشرقی بنگال تھا جہاں مسلم اکثریّت تھی اور دوسری جانب مغربی بنگال تھا جہاں ہندو اکثریّت میں تھے اس لئے سیّد رضوان اللہ یہ چاہتے تھے کہ ناردرن کوریڈور اسکیم فار پاکستان، جس کے تحت مشرقی و مغربی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) کی تقسیم ہونا تھی اس کی شمالی پٹی کو پاکستان کا حصہ بنایا جائے۔ اس خواہش کے پیچھے یہ سوچ کارفرما تھی کی مشرقی و مغربی پاکستان کی پٹی کو جوڑ دیا جاتا جو بعد ازاں (سقوطِ ڈھاکہ) تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اسی جغرافیائی تقسیم کے سبب ہی انڈیا، پاکستان کو دولخت کرنے میں کامیاب ہوا۔

انھوں نے اس ضمن میں کمیشن کے انگریز عہدیداران کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ہر قیمت پر ہندو قائدین کا ساتھ دیں گے۔ اس طرح مرشدآباد اور نادیہ جو مسلم اکثریّت پر مشتمل علاقے تھے انہیں ہندوؤں کی خوش نودی کیلئے انڈیا میں شامل کر دیا گیا تا کہ کلکتہ سے گنگا تک کا پانی کی گذرگاہ انڈیا کے حصہ میں آئے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ وہ پتلی سی پٹّی جس کا ذکر سیّد رضوان اللہ کرتے ہیں وہ پاکستان کو دے دی جاتی کہ وہاں مسلم اکثریّت بھی تھی اور دوسرا ایک خشکی کا راستہ مشرقی و مغربی پاکستان کو مل جاتا مگر انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر وہ علاقہ اس وجہ سے ہندوستان کو دے دیا تا کہ ان کا سڑک سے رابطہ بنگال تک ممکن ہو جائے۔

اس سیاسی نا انصافی کے خلاف سیّد محمد رضوان اللہ نے جان توڑ کوشش کی مگر ہندو، انگریز گٹھ جوڑ کامیاب رہا۔ اسی ناانصافی کی مشقِ ستم کو گورداس پور اور فیروزپور کی تحصیلوں پر بھی آزمایا گیا جو کہ مسلم آبادی کا علاقہ تھا مگر اسے اس لیے بھارت کو دے دیا

گیا تا کہ بھارت وہاں سے کشمیر تک رسائی حاصل کر کے اسے اپنے ساتھ شامل کر لے اور دوسرا پانی کے ہیڈ ورکس انہی علاقوں میں تھے۔ بالآخر وہی ہوا اور 1948ء میں ہندوستان نے بزورِ شمشیر مقبوضہ کشمیر کو ساتھ ملا لیا اور اب پانی کا مسئلہ پاکستان کو درپیش ہے کیوں کہ تمام ہیڈ ورکس بھارت کے قبضہ میں ہیں۔

سیّد محمد رضوان اللہ کی خواہش یہ تھی کہ پورا بنگال پاکستان کا حصّہ بنے چنانچہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے قائدین کے پاس گئے اور انہیں اس تجویز کے متعلق آگاہ کیا۔ سیّد محمد رضوان اللہ اس بات پر مغموم تھے کہ جو مسلمان یہاں رہ جائیں گے ان کا کیا بنے گا۔ اسی تناظر میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان نہیں جائیں گے اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہندوستان میں رہ کر کریں گے۔ اس ارادہ کا ذکر انھوں نے محمد علی جناح سے کیا تو انھوں نے بھی اس فیصلہ کی تائید کی۔ اس پر سیّد محمد رضوان اللہ نے Oath لیا اور اسمبلی کا حلف اٹھا لیا اور مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کے لیے ہندوستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔

اگست 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد جناح جب لیاقت علی خان کے ساتھ علی الترتیب گورنر جنرل اور وزیر اعظم کی حیثیت سے پاکستان جانے لگے تو رضوان اللہ نے دہلی میں اورنگزیب روڈ پر واقع اپنی کوٹھی پر ایک الوداعی تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں نواب اسمٰعیل خان، چودھری خلیق الزّمان اور رضوان اللہ نے تقسیم ہند کے اس نقشہ کو نامنظور کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کا جو مجوزہ نقشہ بنایا گیا ہے وہ کسی صورت قابلِ قبول نہیں بل کہ وہ نقشہ قبول کیا جائے جو یہ قائدین بنا آئے تھے۔ قائد اعظم محمد علی جناح خود بھی اس تقسیم کو نا منظور کر چکے تھے مگر حالات کی نزاکت کو بھانپ کر وہ بعد میں راضی ہو گئے۔

تقسیم ہند کے فوری بعد پنجاب اور دہلی میں فسادات پھوٹ پڑے اور بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری شروع ہو گئی۔ اس وقت رضوان اللہ دہلی میں تھے۔ گاندھی جی نے پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات و قتل و غارت گری کو روکنے اور امن و امان کی بحالی

کے لیے جو چار رکنی وفد بھیجا اس میں حافظ مشتاق، دو ہندو اراکین اور رضوان اللہ شامل تھے۔ موہن داس کرم چند گاندھی کی خصوصی ہدایت تھی کہ رضوان اللہ جس وقت بھی ملاقات کے لیے آئیں انھیں فوراً ان کے پاس پہنچا دیا جائے۔

اس دورہ سے واپسی کے بعد جب وہ دہلی پہنچے تو رفیع احمد قدوائی ان کے پاس نہرو کا پیغام لائے کہ اگر وہ کانگریس میں شامل ہو جائیں تو مرکز یا یو پی میں وزارت کا قلمدان انہیں سونپ دیا جائے گی۔ رضوان اللہ کے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا کہ جس پارٹی کی وہ اب تک مخالفت کرتے رہے محض وزارت کی لالچ میں اس میں شامل ہو کر عوام کو دھوکہ دیں۔ اس لیے انہوں نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ حزبِ اختلاف کی حیثیت سے یوپی میں مسلم لیگ باقی رہ جائیگی لیکن آزادی اور تقسیم ہند کے بعد جو صورتِ حال پیدا ہوئی اس کے پیش نظر یو پی میں مسلم لیگ پر پابندی لگا دی گئی۔ مولانا آزاد اور دوسرے کانگریسی مسلمان راہنماؤں کو نظرانداز کر کے پٹیل اور نہرو نے جب مصلحتاً تقسیمِ ہند کے مطالبہ کو مان لیا تو کانگریس میں ان مسلمان رہنماؤں کا وجود ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا کہ آخر وہ کانگریس میں کس کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مولانا آزاد بالخصوص اس حوالہ سے ہندو تنگ نظری کا نشانہ بنے حالانکہ تحریکِ آزادی میں ان کی خدمات کسی بھی ہندو لیڈر سے کم نہ تھیں۔ اگر نہرو اور پٹیل، مولانا ابوالکلام کو نظر انداز کر کے جناح کے مطالبے کو تسلیم نہ کرتے تو ملک کی تقسیم اتنی آسان نہ ہوتی کیوں کہ جس طرح کی تقسیم پر جناح تیّار ہو گئے تھے اس پر یو پی کے مسلم لیگی رہنما بھی مجوزہ تقسیم کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ کانگریسی لیڈروں نے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے اور ہندو فرقہ پرستوں کو مطمئن کرنے کے لئے تقسیم ہند کی تمام تر ذمہ داری جناح اور مسلم لیگ پر ڈال کر اس پر پابندی عائد کر دی۔

مولانا آزاد نے حکومت کے اشارے پر لکھنو میں تمام سیاسی جماعتوں کی ایک کانفرنس بلوائی اور ان کے رہنماؤں کو ان مسلم سیاسی جماعتوں کو ختم کر کے کانگریس میں

شامل ہونے کا مشورہ دیا۔ اس کانفرنس کی روئداد مولانا حسرت موہانی اپنی سوانح میں بیان کرتے ہیں:

"یو پی مسلم لیگ نے پانچ اصحاب پر مبنی ایک وفد جس میں رضوان اللہ، حسرت موہانی، ذاکر علی فاروق اور نفیس الرّحمٰن شامل تھے مولانا آزاد سے گفت وشنید کے لیے بھیجا۔ جس میں مولانا آزاد نے کھلے لفظوں تمام مسلم لیگی اور مسلم فرقہ پرست پارٹیوں کو فی الفور کانگریس میں ضم ہونے کا عندیہ دیا۔ جس پر یہ تمام لوگ یہ کہہ کر اٹھ آئے کہ ہم لوگوں کی شرکت بے سود ثابت ہوئی"۔

یوں مولانا حسرت موہانی اور رضوان اللہ کی مخالفت کے باوجود تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی اور کچھ مسلم لیگی راہنما تو، راتوں رات کانگریس میں شامل ہو گئے۔ رضوان اللہ ابھی حالات کا جائزہ لے ہی رہے رہے تھے کہ اچانک وقت کے دھارے نے پلٹا کھایا اور 1948ء میں گاندھی جی کے قتل کے بعد ہندو مسلم فسادات نے شدّت اختیار کر لی۔ مسلمانوں سے اسلحہ چھین لیا گیا، گورکھ پور کے کئی سر بر آوردہ حضرات کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ رضوان اللہ، پنڈت پنت کے پاس لکھنو پہنچے اور اس عمل پر احتجاج کیا کہ یہ غصّہ مسلمانوں پر کیوں اتارا جا رہا ہے؟ پنت نے اس حوالہ سے معذوری ظاہر کی۔ تبھی سیّد محمد رضوان اللہ، پنڈت جواہر لال نہرو کو ملنے ان کے گھر دہلی آ گئے اور انہیں ولبھ بھائی پٹیل کے مسلم دشمن روّیہ کی شکایت کی اور زور دیا کہ مسلمانوں سے جو اسلحہ چھینا گیا اسے واپس کیا جائے اور ان کا بہیمانہ قتل روکا جائے۔

اس مرتبہ بھی ہندو پنڈت سے انھیں دھوکا ملا اور پنڈت جواہر لال نہرو جو اس وقت کے وزیر اعظم تھے انھوں نے گاندھی کی طرح یہ جواب دیا کہ وہ سیاسی طور پر کمزور ہیں اور اس صورتِ حال میں کچھ نہیں کر سکتے، اگر کوئی کچھ کر سکتا ہے تو وہ وزیر داخلہ وقومی

امور سردار پٹیل کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے حامیوں کا کابینہ میں غلبہ ہے۔

بہر کیف !اگر آپ کے قریبی رشتہ دار قید و بند میں ہیں تو وہ انھیں ذاتی حیثیت میں رہا کروا سکتے ہیں اسکے بدلے وہ کانگریس میں شمولیت کا اعلان کریں اور وزارت کا قلمدان سنبھال لیں۔ مگر سیّد محمد رضوان اللہ کو یہ بات ہرگز گوارا نہیں تھی۔ اس ملاقات کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستان میں مسلم لیگ کو بین کر دیا اور مسلم قائدین کی گرفتاریوں کا حکم دے دیا۔

سیّد محمد رضوان اللہ اس جواب سے دل برداشتہ ہوئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ ہندو کبھی قابلِ بھروسہ نہیں ہو سکتے۔ جب سیّد محمد رضوان اللہ کو احساس ہوا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے زندگی مشکل بنا دی جائے گی تب انہوں نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا اور وہ سمجھ گئے کہ پاکستان کا وجود ناگزیر تھا۔ ان حالات کے پیش نظر سیّد محمد رضوان اللہ، پنڈت نہرو کی ہی کار میں بیٹھ کر ہوائی اڈہ آئے اور کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

پاکستان پہنچ کر سیّد محمد رضوان اللہ وزیر اعظم پاکستان جناب لیاقت علی خان سے ملے جنھوں نے انتہائی محبت و شفقت سے سیّد محمد رضوان اللہ کو سرکاری عہدے کی پیش کش کی اور معذرت کی کہ وہ سیاسی عہدہ نہیں دے سکتے کیوں کہ اس کے لیے انھیں الیکشن لڑنا پڑے گا اور عوامی نمائندہ منتخب ہو کر اسمبلی میں آنا پڑے گا۔ لیاقت علی خان نے حوالہ دیا کہ اس سلسلہ میں قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی 1946ء کے انتخابات میں لاہور سے الیکشن جیت کر منتخب ہونا پڑا تھا۔ سیّد محمد رضوان اللہ نے کراچی کے سولجر بازار میں سکونت اختیار کی جہاں ان کی رہائش گاہ کا نام منوڑہ کاٹیج تھا۔ قائد ملّت لیاقت علی خان و دیگر سیاسی اکابرین کے مشورہ پر سیّد محمد رضوان اللہ نے محکمہ آبادکاری میں سرکاری عہدہ پر کام شروع کیا اور بعد ازاں جب انہیں آسٹریلیا کا سفیر بنا کر بھیجا جانے لگا تو انھوں نے کہا کہ مجھے مشرقی پاکستان بھیج دیں۔ ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کیلئے انہیں گورنر کے عہدہ کی پیش کش

کی گئی اس پر سیّد محمد رضوان اللہ نے کہا کہ میں پہلے وہاں خود جاؤں گا، صورتحال کا جائزہ لوں گا، اس کے بعد آپ کی پیش کش کا جواب دوں گا۔

جب وہ بنگال گئے اور وہاں کے بدتر سیاسی حالات دیکھے تو انھوں نے گورنری کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور یہ کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے بنگال ایک نو آبادیاتی ہے چناں چہ ان کی جگہ چوہدری خلیق الزّمان کو گورنر بنا کر بھیج دیا گیا۔ ان حالات کا تذکرہ سیّد محمد رضوان اللہ کی تحریر شدہ کتاب ''سیرۃ الرسّول مِن القرآن'' میں بھی ملتا ہے جہاں انھوں نے صدر ایّوب خان کے طرزِ حکومت پر تنقید کی۔ سیّد محمد رضوان اللہ نے سرکاری نوکری کو خیرباد کہہ کر درآمدات و برآمدات کے کاروبار کو اپنایا۔ دین سے رغبت ان کی گھٹّی میں شامل تھی اور اس طرح وہ سیرت و احادیث کی جانب راغب ہوئے اور اپنے والد مولوی سبحان اللہ کی طرح عالم بنے۔

رضوان اللہ کے جانے کے بعد ان کا پورا گھرانہ اپنی بیش قیمت جائدادیں، محل سرائے، کوٹھیاں اور گاؤں کے زرخیز علاقے چھوڑ کر پاکستان منتقل ہو گیا۔ سیّد محمد رضوان اللہ کی ہجرت کی خبر سن کر ان کی رعایا اور کارندوں نے اپنے بلّم اور لاٹھیاں سرنگوں کر لیں اور کفِ افسوس ملنے لگے۔ وہ آج بھی ان کی رعایا اور کارندے ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ ان کی حویلی بولیا، مدائن کھنڈرات کا عبرت ناک منظر پیش کر رہی ہیں اور زبانِ حال سے فریاد کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر سیّد محمد رضوان اللہ جذبات سے کام نہ لیتے اور پنڈت نہرو کی پند دانا کو قبول کر لیتے تو رفیع احمد قدوائی سے کم ان کی قدر و منزلت نہ ہوتی اور وہ اپنی خاندانی جائیدادیں اور مال و متاع بچا لیتے۔ اپنے علم و فضل کے کئی اعتبار سے معروف یہ شخصیت 1964ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی۔

ع ..... ڈھونڈ انہیں چراغِ رخِ زیبا لے کر

باب دوئم

ہجرت وَجہِ وَصل بھی بنتی ہے!

132ھ (750ء) میں ابوالعباس السفاح اور ابو جعفر المنصور نامی دو بھائیوں نے بنو امیہ کو شکست دے کر ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی جسے خلافتِ عباسیہ کے نام سے جانا گیا۔ ہر عروج کو زوال ہے کے مصداق 37ویں بادشاہ مستعصم باللہ (640-656ھ) کے دور میں عباسی حکومت کمزور پڑ گئی۔اس زوال کی بہت سی وجوہات میں مالی اور اخلاقی کمزوریاں بہت نمایاں تھیں مگر بنیادی وجہ غیر سنجیدہ رویے تھے۔اس دور میں دفاع پر توجہ بالکل ختم ہوگئی ۔ 1258ء میں تاتاریوں نے بغداد (عراق) کی اینٹ سے اینٹ بجا دی یوں 508 سالہ طویل دورِ حکومت عبرت ناک طریقہ سے اپنے انجام کو پہنچا۔یہی سانحہ تاریخ کے اوراق میں سقوطِ بغداد کے عنوان سے محفوظ ہے۔ مؤرخین کے مطابق اس عہد میں ایک لاکھ سے لیکر دس لاکھ مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ بغداد کو جلا کر راکھ کر دیا گیا ،یہاں تک کہ کتب خانوں اور بیت الحکمت کو بھی نذرِ آتش کر دیا۔عوام کا کوئی پرسان حال نہ تھا ،معززین کی پگڑیاں اچھالی جا رہی تھیں۔ کہیں کوئی جائے امان نہیں تھی ،شاید اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں کہ ابوالعباس السفاح نے جو بربریت اہلِ دمشق اور بنو امیہ کے ساتھ روا رکھی ،وہی تاریخ مستعصم باللہ، شاہی خاندان اور اہلِ بغداد کے ساتھ دہرائی گئی۔ معززینِ شہر کے سامنے عزت اور جان بچانے کے لیے ہجرت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

بھلا دوں کس طرح سیماب صد سالہ تعلق کو
مِرا سرمایۂ ماضی ابھی ہندوستاں میں ہے

ایسے ہی خاندانوں میں بنو عباس کے محکمہ قضا کے ایک قاضی کا خاندان بھی شامل تھا، جنھوں نے اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ بغداد سے برصغیر کی ریاست اتر پردیش کے مشہور شہر گورکھ پور کو اپنا مسکن بنانے کا فیصلہ کیا۔ شمالی ہند کی یہ ریاست اپنے علم و ادب کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور تھی۔ اسی خاندان کے ایک چشم و چراغ قاضی منظورالحق بھی تھے۔

عربی النسل قاضی منظورالحق نے اپنی خاندانی روایات کو گورکھ پور میں جاری رکھا اور ان کی مکمل توجہ حصولِ تعلیم پر رہی۔ انہوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی کیا۔ یہاں ان کے مزاج میں صرف ایک تبدیلی آئی کہ انھوں نے پیشہ وارانہ زندگی کے لیے اپنے آباء کے محکمہ قضا کی بجائے درس وتدریس کو فوقیت دی۔ وہ پیغمبرانہ پیشہ سے منسلک ہوئے اور ریلوے کے اسکول میں مدرس کے طور پر منتخب ہوئے۔ وہ ریلوے پبلک اسکول میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر کے طور پر بھی تعینات رہے۔ یہ اسکول بعد میں بوجہ قلتِ وسائل بند کر دیا گیا۔ قاضی منظورالحق نے بہ طور مدرّس بنگال کے مختلف شہروں میں بھی کافی وقت گزارا۔ اسکول کی تدریس سے کالج کی تدریس کی طرف رخ کیا تو الٰہ آباد کے مشہور شبلی کالج میں بہ طور لیکچرار منتخب کر لیے گئے۔ اسی کالج میں پاکستانی فوج کے سابق سربراہ مرزا اسلم بیگ بھی ان کے شاگرد رہے۔ قاضی منظورالحق نے اپنا ملازمت کا زیادہ تر دورانیہ مشرقی پاکستان میں گذرا اور 1958ء میں دوسری دفعہ ہجرت کر کے وہ مغربی پاکستان منتقل ہوئے جہاں ان کی نئی پوسٹنگ بطور ڈپٹی ہیڈ ماسٹر ریلوے پبلک اسکول مانسہرہ روڈ ایبٹ آباد پاکستان (موجودہ ایبٹ آباد پبلک اسکول) کر دی گئی۔ ریلوے کے اس سکول میں قاضی منظورالحق کے ہیڈ ماسٹر ایک برطانوی استاد تھے۔ یہ سکول جنرل ایوب خان کے بھائی قیّوم خان نے بنوایا تھا۔ اس

پبلک سکول کا شمار بلاشبہ اُس وقت کے مشہور و معروف سکولوں میں ہوتا تھا اور آج بھی یہ سکول ایبٹ آباد میں موجود ہے۔ اُس دور میں انگریزوں کو deputation پر بلوایا جاتا تھا اور بھاری معاوضہ کے عوض ان کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ ریلوے کے لیے اس سکول کے مالی اخراجات کا بوجھ اٹھانا ممکن نہیں تھا اس لیے اس سکول کو بند کرنا پڑا اور یوں 1960ء میں قاضی منظور الحق کا تبادلہ لاہور کر دیا گیا۔

یہاں قاضی منظور الحق کو گڑھی شاہو لاہور میں ریلوے کے ایک نئے تعمیر شدہ سکول کے نظم و نسق کو چلانے کا فریضہ سونپا گیا۔ 1960ء سے لے کر 1970ء تک قاضی منظور الحق لاہور میں رہے اور انھوں نے اس سکول کی ابتدا ایک خیمہ سے کی۔ آج اس سکول کا شمار لاہور کے بہترین سکولوں میں ہوتا ہے۔ 1960ء میں میاں شریف (والد نواز شریف سابق وزیرِ اعظم پاکستان) باقاعدگی سے اس سکول کی مالی معاونت کرتے تھے۔ اس زمانے میں میاں شریف گڑھی شاہو میں اپنے خاندان کے ساتھ رہایش پذیر تھے۔ میاں شریف کے تین بیٹے میاں نواز شریف، میاں شہباز شریف اور میاں عباس شریف بھی قاضی منظور الحق کے شاگرد رہے اور میاں شریف کے یہ بچے ٹیوشن کے لیے بھی قاضی منظور الحق کے یہاں جاتے تھے۔ بعد ازاں میاں نواز شریف وزیرِ اعلیٰ اور وزیرِ اعظم بنے اور میاں شہباز شریف پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ رہے بعد میں میاں شہباز شریف قومی اسمبلی میں قائدِ حزبِ اختلاف منتخب ہوئے جبکہ تادمِ تحریر میاں شہباز شریف وزیرِ اعظم پاکستان کے عہدے پر متمکن ہیں۔

قاضی منظور الحق 1970ء میں بہ طور ہیڈ ماسٹر ریٹائرڈ ہوئے اور واپس میر پور خاص (سندھ) اپنی زمینوں پر آ گئے اور زمین داری شروع کر دی۔ ان کی وفات 1980ء میں میر پور خاص میں ہوئی اور وہیں مدفون ہیں۔

قاضی منظور الحق کثیر العیال تھے انہوں نے چار شادیاں کیں۔ ان کی پہلی زوجہ سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ دوسری بیوی سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ تیسری منکوحہ سے

پھر اولاد نہیں تھی جبکہ چوتھی بیگم سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

باب سوئم

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے

قاضی منظور الحق کی اولاد میں سے ان کے ایک بیٹے قاضی محبوب الحق نے افواجِ پاکستان میں شمولیّت اختیار کی اور پاک فضائیہ میں بہ طور جی ڈی پائلٹ اپنے فرائض سرانجام دئے ۔قاضی محبوب الحق کا شمار پاک فضائیہ کے ان اوّلین ہوا بازوں میں ہوتا ہے جو امریکہ سے تربیّت یافتہ تھے اور فن ہوا بازی کی شاندار مہارتوں سے واقف تھے۔ ان کی تربیّت 1960 کی اس دہائی میں ہوئی جب بھارت کا جنگی جنون عروج پر تھا اور پاکستانی افواج اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے مستعد تھیں۔ اس حوالہ سے فضائی عسکری قوّت ایک گیم چینجر کی حیثیّت رکھتی تھی۔

1965 میں پاک فضائیہ کے شاہینوں نے دشمنوں کے دانت جس بمبارڈ ائیر کرافٹ سے کھٹے کئے وہ ائیر کرافٹ امریکی ساخت کا مارٹن بی 57 تھا۔ اس ائیر کرافٹ کو Night Intruder کے نام سے بھی جانا جاتا ہے ۔ یہ جنگی طیارہ دو عدد ٹربو جیٹ انجنوں پر مشتمل 500 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے 50000 فٹ کی بلندی پر بھی دشمنوں پر حملہ آور ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ بمبار طیارہ بیک وقت 56 راکٹوں اور 800 lbs کے تباہ کن بموں سے لیس بڑے سائز کا ایک جنگی طیارہ تھا جسے 1955ئمیں پاک فضائیہ کے بحری بیڑہ میں شامل کیا گیا۔

اس بڑے جنگی بمبار میں دو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی تھی۔ اُس دور میں

پاک فضائیہ میں یہ امریکی ساختہ 26 مارٹن بی 57 جہاز شامل ہوئے اور پاکستانی ہوا بازوں کو ان جہازوں کو اڑانے کی تربیت حاصل کرنے کے لیے امریکہ بھیجا گیا۔ ان پہلے تربیت یافتہ پائلٹس میں قاضی محبوب الحق بھی شامل تھے جو 1962ء میں امریکہ سے جنگی جہاز اڑانے کی تربیت حاصل کر کے پاکستان لوٹے تھے۔

1965ء کی جنگ میں انھی مشاق ہوا بازوں کی بہادری کے سبب پاکستان نے اپنے حریف دشمن، ہندوستان پر برتری حاصل کی۔ پاکستانی شاہینوں نے شمال میں جمناگر اور جودھاپور کے فضائی میدان میں دشمنوں کی نیندیں حرام کیں جبکہ شمال میں انبالہ، احمد پور، حلوارا، سری نگر اور پٹھان کوٹ میں دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ ہمت و جوان مردی کے یہ غازی دشمنوں کیلئے دہشت کی علامت تھے۔ 1965ء کی جنگ میں ان 26 جہازوں میں سے 22 جہازوں نے جنگ میں حصہ لیا اور دشمن کو بھاری جانی و مالی نقصان پہنچا کر لوٹے۔ اس جنگ میں پاک فضائیہ کے صرف تین جہازوں کو نقصان ہوا اور 6 پائلٹس نے جامِ شہادت نوش کیا۔ یہ ہوا باز صرف 2000 فیٹ کی نچلی پرواز کرتے ہوئے اپنی تکنیکی مہارت کا مظاہرہ کرتے اور دشمن فقط اِن کی اِس اڑان کو حیرت سے تکتا ہی رہا۔ یہ بہادر جوان آج بھی جرأتوں کے نشاں بن کر اپنے دشمن کے لیے خوف کی علامت ہیں۔ اور اپنی عظمت و ہمت کی روشن مثال ہیں۔

1965ء کی معرکہ آرائی کے بعد دشمن کو اپنی فضائی سرحدوں سے دور رکھنے کے لیے 1969ء میں کراچی کی فضاؤں میں پائلٹ قاضی محبوب الحق اور ان کے ساتھی سکوارڈن لیڈر اختر اپنا مشن کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے بعد لوٹ رہے تھے کہ اچانک ان کے جہاز B-57 میں فنی خرابی پیدا ہوئی، اس قومی اثاثہ (طیارہ) کو ہر ممکن بچانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ جاں باز اسے شہری علاقہ سے دور لے آئے۔ یہ کوشش اس لیے تھی کہ اگر طیارہ نہ بچایا جاسکے تو کم از کم شہری آبادی کو نقصان نہ پہنچے۔

مستعد پائلٹ کاک پٹ میں طیارے کو فضا میں بلند کرنے کی کوشش میں

مصروف تھے کہ اچانک طیارے کے ایک انجن نے آگ پکڑ لی۔ پائلٹ نے اپنے ساتھی آفیسر سے کہا کہ وہ Eject کر جائے جبکہ وہ آخر تک اس طیارہ کو بچانے کی کوشش کرینگے۔

انھیں احساس تھا کہ اس ملک پاکستان کی پونجی یہی طیارہ ہے اس لیے وہ طیارہ بچانے کی سر توڑ کوشش کرتے رہے۔ اس وقت اس جرّی پائلٹ کا ایک کم سن بیٹا تھا اور جوان بیوی تھی جو منتظر تھی کہ ان کا شوہر اپنے فرائض کی انجام دہی کے بعد لوٹے گا۔ مگر یہ عظیم انسان ان سب چیزوں سے ماورا اپنے آپ کو وطن کی عزت پر قربان کرنے کے لیے تیار اس Black Eagle کو قریبی ایئر بیس تک پہنچانے کی کوشش میں تھا۔ اسی کشمکش میں طیارہ نے مزید آگ پکڑ لی اور طیارہ بے قابو ہو کر ڈگمگانے اور فضا میں قلابازیاں کھانے لگا۔ اپنی جان توڑ کوششوں میں مصروف پائلٹ قاضی محبوب الحق، طیارے کو اونچائی چھوڑتا دیکھ رہے تھے، مگر وہ اب بھی جہاز چھوڑنے (Eject) کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے طیارہ کو قابو میں کرنے کی آخری کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اب طیارہ زمین کے بہت قریب آ چکا تھا، اس سے پہلے کہ بلندی 200 فٹ سے کم ہوتی اور قاضی محبوب الحق طیارہ کو نہ چھوڑ سکتے انہوں نے Eject کا بٹن دبا دیا۔

(نوٹ) یاد رہے کہ درست Ejection کے لیے کم از کم اونچائی ایک ہزار فیٹ ضروری ہے تا کہ پیراشوٹ کھل سکے۔ قاضی محبوب الحق تو Eject کر گئے مگر ان کے دوسرے ساتھی طیارے سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور وطن پر قربان ہو گئے۔

دوسری جانب پائلٹ قاضی محبوب الحق کی زوجہ محو انتظار ہیں کہ اچانک فضائیہ کی ایک گاڑی نمو دار ہوتی ہے اور اس میں سے نکلنے والے آفیسران انہیں کہتے ہیں کہ آپ کے شوہر، پائلٹ قاضی محبوب الحق صاحب اچانک پیٹ کے درد میں مبتلا ہو کر ہسپتال میں داخل ہیں۔ ان کی زوجہ شاہدہ محبوب پریشانی کے عالم میں اپنے بڑے بیٹے محمود کو گود میں سنبھالے بمشکل گاڑی میں سوار ہو کر شفاء ہسپتال کراچی کی جانب سراسیمگی کی کیفیت سے

دوچار، ذہن سے خیالِ غلطاں کو جھٹکتے ہوئے، آنسو بہاتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے شوہر کی صحت مندی کی دعائیں کرتے ہوئے ہسپتال کی طرف دھڑکتے دل کے ساتھ رواں دواں تھیں۔ ان کے ذہن میں بار بار یہی خیال آتا رہا کہ پیٹ کے درد کیلئے تو نہیں بلایا گیا! بات کچھ اور ہے!

پائلٹ قاضی محبوب الحق اس بات سے باخبر تھے کہ دو سو فیٹ کی اونچائی سے ان کا پیرا شوٹ نہیں کھل پائے گا اور ایسا ہی ہوا انکا پیرا شوٹ نہ کھل سکا اور وہ کسی بھاری پتھر کی مانند زمین سے آ ٹکرائے۔ زمین سے رگڑیں کھاتے ہوئے انھیں ناقابلِ بیان چوٹیں آئیں، جسم کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور وہ درد سے کراہتے ہوئے کھلے میدان میں بمشکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے زخموں سے چور جسم کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے قدرے آبادی کی جانب رخ کیا۔ وہ اس پتھریلے میدان سے کسی نہ کسی طرح نکل کر مرکزی راستہ پر اپنی قوّتِ ارادی اور عزم صمیم سے قریبی آبادی میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت وہ اپنی کٹھن فوجی ٹریننگ کے بل پر خود کو سنبھال پائے ایک آبادی کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو کر اپنا تعارف کرواتے ہی شدید جسمانی صدمہ کے باعث بے ہوش ہو گئے۔ وہاں کے لوگوں نے وطن کے اس محافظ کو عزت و احترام کے ساتھ بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچایا۔

محترمہ شاہدہ محبوب، گومگو اور صدمہ کی کیفیت سے دو چار شفاء ہسپتال پہنچیں جہاں ڈاکٹر جمعہ اور ان کی ٹیم انھیں حوصلہ دلاتے ہوئے انتہائی نگہداشت کے کمرہ میں لے آئے۔ وہاں ان کے شوہر پائلٹ قاضی محبوب الحق بے سدھ بستر پر دراز تھے۔ اپنے شوہر کو اس حالت میں دیکھ کر وہ رو پڑیں اور اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے اپنے شوہر کی صحت کے لیے دعائیں کرتی رہیں۔ اللہ سبحان و تعالیٰ نے اس نیک خاتون کی دعاؤں اور وفاؤں کا صلہ بخشا اور ان کے شوہر نے آنکھیں کھول کر اپنی بیوی اور بچے کو مسکرا کر دیکھا۔ رب کریم مہربان ہوئے اور اپنی خصوصی رحمت سے اپنے بندوں کو نوازا۔

اس حادثہ سے نبرد آزمائی کے بعد ان کا فلائنگ کیریئر طبی بنیادوں پر متاثر ہو کر داؤ پر لگ گیا تھا۔ میڈیکل رپورٹ آنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ آئندہ جہاز تو نہ اڑا سکیں گے تاہم ان کی خدمات پاک فضائیہ کو دیگر شعبوں میں حاصل رہیں گی۔ قاضی محبوب الحق کے لیے یہ اطلاع کسی صدمہ سے کم نہیں تھی کیونکہ جہاز اڑانا ان کا شوق ہی نہیں بلکہ جنون تھا۔

جو ہویا اے او ہونا ای سی
تے ہونی، روکیا رکدی نئیں

شوقِ شہادت اور ملک وقوم سے وفاداری رگ و پے میں موجود ہو تو تکلیف کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی حال قاضی محبوب الحق کا ہوا جنہیں اس حادثہ کے بعد اپنا کیریئر معدوم ہوتا نظر آیا کیونکہ ڈاکٹرز کی ٹیم نے انھیں یہ بتا دیا تھا کہ وہ آئندہ جہاز نہیں اڑا پائیں گے۔

پائلٹ قاضی محبوب الحق کے Flying Hours اٹھارہ سو گھنٹے ہو چکے تھے اور ڈاکٹرز کے مشورہ کے بعد انہیں کچھ عرصہ تک اپنا Flying Career چھوڑنا پڑا جو اُن کے لیے سوہانِ روح سے کم نہ تھا۔ پاکستان ایئر فورس نے انھیں فلائنگ کے شعبہ سے نکال کر گراؤنڈ کر دیا اور ان کی تعیناتی ایئر فورس کے کالج آف ایرو ناٹیکل انجنیئر نگ کورنگی میں کر دی گئی۔ ۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا اور سقوط ڈھاکہ کے مضمرات کو جانچنے اور مزید منصوبہ سازی کے لیے حمود الرّحمٰن کمشن بنایا گیا جس میں کئی وجوہات کے علاوہ ایک اہم وجہ یہ سامنے آئی کہ پاکستان نیوی کے پاس فضائی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے دشمن اپنا وار کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ جو دفاعی نکتہ نظر سے مناسب نہیں تھا۔ اس کمیشن نے یہ سفارش کی کہ فوری طور پر پاکستان فضائیہ سے مدد لی جائے اور Contingent Basis پر پائلٹس کو نیوی افسران کی تربیت اور بحریہ کی فضائی برتری اور صلاحیتوں کے اضافہ کی خاطر پانچ سال کی Deputation پر فضائیہ کے پائلٹس کو نیوی میں معمور کر دیا جائے۔

ان پائلٹس میں پائلٹ قاضی محبوب الحق اور جمشید اکبر (والد جنید جمشید مرحوم) شامل تھے۔ یوں پائلٹ قاضی محبوب الحق کو ایک بار پھر اپنے وطنِ محبوب پر جانثاری اور فرائض کی انجام دہی کیلئے ایک شان دار موقع میسر آ گیا۔

(بحوالہ https://www.paknavy.gov.pk) ›

امریکی بحریہ کی فضائی قوت کا اندازہ اس بات سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے معمول کی فضائیہ سے نیول فضائیہ وسعت و مہارت کے اعتبار سے کہیں زیادہ ایئر اسٹرائیک کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ امریکہ کے تمام ایئر اسٹرائیک کی ذمّہ داری نیوی کی ہوتی ہے اور ان کے جہاز زیادہ تر نیوی کے پائلٹس آپریٹ کرتے ہیں اور پائلٹس کی تعداد فضائیہ کے مقابلہ میں نیوی میں زیادہ ہے اور وہ بحری بیڑوں سے اپنی اڑان بھرتے ہیں۔ پاکستان میں بھی اسی طرز پر نیوی کو مضبوط اور فضائی حملوں کو موثر بنانے کے لیے فضائیہ سے پائلٹس کو منگوایا گیا اور یوں پاکستانی بحری سرحدوں کو محفوظ کیا گیا۔

اسی زمانے میں دیگر جدّتوں کے ساتھ پاکستان نیوی کو اینٹی سب میرین ٹیکنالوجی سے مزیّن کیا گیا۔ اسی ضمن میں تحقیق سے ثابت ہوا کہ فرانس کو اینٹی سب مرین اٹلانٹک جہاز کی وجہ سے عسکری برتری حاصل ہے یہ اینٹی سب مرین جہاز سمندر پہ جب اڑتا ہے تو سمندر میں موجود آبدوز کو ڈھونڈھ کر ڈبو دیتا ہے۔ اٹلانٹک، فوکر کی طرز کا ایک بڑا جہاز ہے جو پندرہ سے بیس تکنیکی ماہرین پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ CREW اس کے اسلحہ، ریڈار وغیرہ کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یوں پاکستان نے فرانس سے تین بریگویٹ اٹلانٹک جہاز خریدے اور ان کے اڑانے کی تربیت اور دیگر مہارتوں کے حصول کے لیے اپنے ہوابازوں کو فرانس بھیجا۔

ایک پاکستانی اٹلانٹک جہاز کو انڈیا نے 1999ء میں مار گرایا تھا اور یہ الزام لگایا تھا کہ یہ جہاز انڈیا کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ پاکستان کے نیول بیڑہ میں یہ جہاز عسکری برتری کی علامت رہے ہیں اور پاکستان نیوی نے تین بریگویٹ اٹلانٹک

بمبارڈ جہاز اپنی سمندری حدود کی حفاظت کی خاطر لیے تھے اور ان میں سے ہی ایک جہاز، قاضی محبوب الحق اڑایا کرتے تھے۔ یہ وہی جہاز تھا جسے بعد ازاں انڈین فضائیہ نے اس وقت مار گرایا تھا جب معمول کی پرواز پر اپنی ہی فضائی حدود میں موجود تھا۔ اس حادثہ میں جہاز کے ساتھ ساتھ عملہ کے بیس ارکان نے جامِ شہادت نوش کیا۔

قاضی محبوب الحق وہ پہلے پائلٹ تھے جنہوں نے اس جہاز میں اڑان بھری اور 1975ء سے لے کر 1979ء تک وہ اس جہاز کو اڑاتے رہے۔ 23 مارچ کی پریڈ ہو یا وطنِ عزیز کی سمندری سرحدوں کی نگرانی، وطن کا یہ بیٹا اپنا فرض نبھاتا رہا اور اپنے خاندان اور بچوں کے لیے باعث فخر و تقلید رہا۔

1975ء میں قاضی محبوب الحق کو فرانس کے شہر Nimes بھیجا گیا تاکہ وہ فلائنگ کے جدید اصولوں سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ فرانس سے واپسی پر 1979ء میں قاضی محبوب الحق کو پشاور میں ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنس فضائیہ بنا دیا گیا اور ساتھ ہی ڈائریکٹر انٹیلی جنس فضائیہ کی اہم اور حساس ترین ذمہ داری پر معمور کیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب یونائیٹڈ اسٹیٹ آف رشیا نے افغانستان پر حملہ کر دیا تھا اور قیاس یہ تھا کہ روسی افواج پاکستان پر مہم جوئی کر دے گی۔ اِس صورتِ حال میں ڈائریکٹر انٹیلی جنس پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ روزانہ کی بنیادوں پر اپنے ایئر چیف کو تازہ ترین صورتحال سے مسلسل آگاہ رکھیں گے۔ روسی افواج اس حوالہ سے آئے دن پاکستانی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتے تھے اور ان کی اِن خلاف ورزیوں کی ایک باقاعدہ جامع رپورٹ، روزانہ کی بنیاد پر تیار ہوتی اور اسے چیف ایئر انٹیلی جنس کو پیش کیا جاتا۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر مستقبل کا لائحہ عمل تجویز پاتا۔

یہ وہ دن تھے جب پاکستان اور روس میں سرد جنگ اپنے عروج پر تھی۔ افغانستان کا تنازعہ شدت اختیار کر چکا تھا۔ نہ صرف پاکستان، بلکہ پوری دنیا کی نظریں اس خطہ پر تھی۔ اسی رپورٹ کی بناء پر افواجِ پاکستان اپنا جنگی لائحہ عمل بناتی اور اسی Brief

Report کی بنیاد پر اپنی دفاعی حکمت عملی مرتب کرتی۔ اسی سرد جنگ کے تناظر میں ایک اور واقعہ ضبطِ تحریر ہے۔

1979ء میں پشاور کا ائر بیس بڈابیر امریکیوں کے زیر استعمال تھا جہاں سے امریکی، روسیوں کی جاسوسی کیا کرتے تھے۔ یہ کالونی ایسی تھی جو پاکستان میں امریکہ کا نظارہ پیش کرتی تھی کیوں کہ یہاں امریکی اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتے تھے اور ان کا پاکستانی آفیسران کے ساتھ کافی میل جول تھا۔ امریکہ اپنا ایک جہاز یوٹو، آپریٹ کرتا تھا اس جہاز کی خاصیّت یہ تھی کہ وہ 80 ہزار فیٹ سے بھی زائد کی بلندی پر پرواز کرسکتا تھا جس کی وجہ سے کوئی بھی روسی میزائل اسے ڈاؤن نہیں کرسکتا تھا۔ امریکیوں کو یقین تھا کہ اسے نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس پائلٹ کی ذمّہ داری یہ تھی کہ وہ تصاویر کی شکل میں، روسی فوج کی تازہ ترین نقل وحمل اور فوجی انسٹالیشن کے متعلق آگہی فراہم کرتا تھا۔ پائلٹ کو یہ ہدایات تھیں کہ اگر کبھی طیارہ Hit ہو جائے تو وہ اپنے دائیں طرف کے بازو کی جیب میں سے زہریلا کیپسول نکال کر چبا لے اور کسی قسم کی کوئی معلومات روسیوں کے ہاتھ نہ لگنے دے۔ شومئی قسمت کہ ایک مرتبہ یہ طیارہ Hit ہو گیا اور پائلٹ نے بیل آؤٹ کر دیا اور روسیوں کے ہاتھ لگ گیا۔ دورانِ تفتیش اس پائلٹ نے بتا دیا کہ وہ یہ آپریشن پاکستان سے کرتے ہیں اور اس بات پر نکیٹا خروشیف روسی سیکرٹیری نے UNO میں اپنی تقریر کے دوران جوتا ڈائس پر مار مار کر اعلان کیا کہ وہ اس علاقہ کو ملیا میٹ کر دے گا اور ایٹم بم مار دے گا اور دوسری دھمکیاں دیں جس سے امریکہ نے فوری طور پر اس علاقہ کو خالی کر دیا۔

دوسری جانب یہ قاضی محبوب الحق ہی تھے جنہیں اپنی ذہانت، فرائض منصبی سے لگن، جذبہ حب الوطنی اور اپنے وطن پر جاں نثاری کی بدولت ایسی اہم ترین ذمہ داری سونپی گئی۔ ایسے میں انہیں ادارے کا اعتبار حاصل ہوا جس کی بدولت وہ براہ راست ائیر چیف کو رپورٹ کرتے۔ ملک ایک نازک دور سے گزر رہا تھا اور قاضی محبوب الحق نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر بڈابیر ائیر بیس پر انتہائی اہم فرائض سرانجام دیئے۔

قاضی محبوب الحق، قاضی منظور الحق کے صاحب زادے ہیں جنھوں نے گورکھ پور میں اپنے عزیز ترین دوست مولوی سبحان اللہ کی وفات کے بعد ان کی اولاد کا اپنی اولاد کی طرح خیال رکھا۔ مولوی سبحان اللہ کے صاحب زادے سیّد محمد رضوان اللہ، قاضی محبوب الحق کے خسر تھے۔ یہ دونوں وہ خانوادے ہیں جنھوں نے پہلے قیامِ پاکستان کے لیے بے پناہ خدمات سرانجام دیں اور بعد میں انھوں نے اور ان کی اولادوں نے استحکامِ پاکستان کیلئے گراں قدر کارہائے نمایاں انجام دیے اور آج بھی ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔

قاضی منظورالحق، محکمہ ریلوے کے سکول سے ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہونے کے بعد میرپور خاص سندھ میں زمیں دارہ کرتے رہے اور اپنی زندگی کے آخری ایّام وہیں گذارے۔ ان آخری ایام میں وہ اپنے تمام بچوں اور پوتے، پوتیوں کے ساتھ وقت گذارنے کے لیے ان کے گھروں پر تشریف لے جاتے کیوں کہ تعلیم و تعلّم سے وابستگی رہی تھی اس نسبت سے وہ اپنے پوتوں کو تعلیمی میدان میں مدد فراہم کرتے اور انہیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے تیاری کرواتے تھے۔ علم دوستی اس گھرانہ کا طرّہ امتیاز تھی اور آج بھی ہے۔ عملی میدان میں اس گھرانے نے علم دوستی کی تاریخ اور تعلق کو ہمیشہ نبھایا۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی منظور الحق کی اولاد کی اولاد بھی انتہائی اعلی تعلیم یافتہ و مہذب ہے اور یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

1971ء میں قاضی اطہر محبوب پیدا ہوئے قاضی محبوب الحق اس وقت پی اے ایف بیس کورنگی کریک میں تعینات تھے۔ پاک فضائیہ کو ہمیشہ سے ہی با صلاحیت اور جاں باز پائلٹس کی خدمات حاصل رہیں جن کی بہادری کی وجہ سے فضائی سرحدیں آج بھی محفوظ ہیں اور انہی کی قربانیوں کے سبب ہم چین کی نیند سوتے ہیں۔

باب چہارم

پدرم سلطان بود

ہندوستان کی سرزمین سے ہجرت کر کے آنے والے قاضی منظورالحق اور سیّد رضوان اللہ کے دونوں خاندان اپنے گھر بار اور بزرگوں کی قبریں چھوڑ کر پاکستان منتقل ہو گئے۔ حقیقت میں ہجرت کے سب سے تکلیف دہ لمحے یہی ہوتے ہیں ۔ اِن خاندانوں کے بزرگوں نے اپنی دوستی میں ایثار و محبت کو ہمیشہ جگہ دی اور اپنے تعلقات کو نبھانے کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ ہجرت کے بعد بھی ان دونوں خاندانوں کا دوستانہ قائم رہا اور پاکستان آ کر ان بزرگوں نے اس دوستی کو اٹوٹ تعلق میں بدلنے کا سوچا۔

قاضی منظورالحق نے سیّد رضوان اللہ سے اپنی دوستی کو رشتہ داری میں بدلنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ان کی صاحب زادی شاہدہ کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کیا۔ دونوں خاندانوں کی رضامندی کے بعد شاہدہ کا نکاح 1967ء میں قاضی محبوب الحق سے کر دیا گیا یوں نئی پیڑھی ، پرانے رشتوں کو لے کر آگے چلی ۔

قاضی محبوب الحق جذبہ حب الوطنی رکھنے والے مجاہد ہیں۔ اوائل عمری میں ہی ملکی فضائی سرحدوں کی نگرانی و نگہبانی کا فریضہ اختیار کیا اور 1962ء میں امریکہ سے فلائنگ کی تربیت حاصل کر کے لوٹے اور کراچی کے پی اے ایف بیس ماڑی پور ہاکس بے (موجودہ پی اے ایف بیس مسرور) میں بہ طور فلائنگ آفیسر تعینات ہوئے۔ سمندر کے وسیع کناروں پر موجود پاکستان ایئر فورس کے دو بیس پی اے ایف بیس کورنگی اور ماڑی پور میں قاضی

محبوب الحق اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کا لوہا منواتے رہے۔ پی اے ایف بیس ماڑی پور ایک فلائنگ آپریشنل بیس ہے جہاں سے فضائی آپریشن لانچ ہوتا ہے اور اپنی ملازمت کی ابتدا میں اسی بیس پر قاضی محبوب الحق ایف۔86 فائٹر طیارہ اڑایا کرتے تھے۔ پی اے ایف بیس کورنگی کریک کلفٹن سے بھی قاضی محبوب الحق کا پیشہ وارانہ تعلق رہا کیونکہ یہ بیس انجینئر نگ اور اڑان بازی کے فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔ قاضی محبوب الحق نے پاکستان فضائیہ کے کراچی میں موجود چاروں فضائی بیسس پر فرائض انجام دیئے جن میں سے باقی دو پی اے ایف ڈرگ روڈ (موجودہ شاہراہِ فیصل) جو کراچی شہر کے وسط میں ہے یہاں سے سی ون تھرٹی جہاز کارگو، پسنجر نگ اور دیگر نقل وحمل کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ چوتھا ائیر بیس پی اے ایف ملیر کراچی میں واقع ہے جہاں زیادہ تر انجینئر نگ، سافٹ ویئر، رے ڈار اور دیگر تکنیکی ائیر فورس کے یونٹ موجود ہیں۔

ابتدائی فرائض کی انجام دہی میں قاضی محبوب الحق امریکہ سے اپنی ٹریننگ کی تکمیل کے بعد فضائی آپریشنل حوالوں سے ماڑی پور ائیر بیس پر تعینات رہے جہاں انھوں نے بمبارڈ طیارے اڑائے۔

1962ء سے لے کر 1967ء تک وہ اسی بیس پر تعینات رہے۔ 1967ء میں رشتہء ازدواج میں منسلک ہوئے اور اسی سال انھیں مارٹن بی 57 بمبارڈ ایئر کرافٹ اڑانے کا موقع ملا جس کی تربیت انہوں نے امریکہ سے حاصل کی تھی۔ یہ اپنی نوعیت میں اس وقت کا جدید ترین طیارہ تھا جس سے دشمن کی نقل وحمل اور پیش قدمی کو موثر انداز میں روکا جا سکتا تھا۔ اس دور میں یہ طیارہ اڑانا ایک اعزاز سے کم نہیں تھا۔ 1970ء میں نیو کراچی کی پہاڑیوں میں تکنیکی مسائل کی وجہ سے یہ جہاز کریش ہو گیا اور قاضی محبوب الحق اس حادثہ میں شدید زخمی ہوئے تھے۔ اس حادثہ کے بعد ان کو فلائنگ کیٹیگری سے روک دیا گیا اور اس حادثہ نے ان کی پیشہ وارانہ معمولاتِ زندگی کو یک سر بدل دیا اور وہ اپنے

محبوب مشغلہء ہوابازی سے محروم ہو گئے، جیسا کہ ڈاکٹرز کی رائے تھی کہ اب وہ کبھی اڑان نہیں بھر سکیں گے مگر قدرت اور قسمت نے ان سے بڑا کام لینا تھا اور شائد قدرت کی طرف سے انھیں مزید چیلینجز کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔

وقت کی روش کبھی یکساں نہیں رہتی اور قدرت جب کسی کو خیر و خدمت کیلئے چن لیتی ہے تو انتظامات بھی ساتھ کر دیتی ہے۔ نیورو سرجن کی تجویز کے برعکس قاضی محبوب الحق کے گذشتہ مہارتی تجربہ کو مدّنظر رکھتے ہوئے انہیں بہ طور نیوی گیٹر فرائض کی انجام دہی کیلئے ایک مرتبہ پھر منتخب کر لیا گیا۔

قاضی محبوب الحق نے نیوی گیٹر کا کورس کیا اور اس کورس کی کامیاب تکمیل کے بعد وہ پی اے ایف بیس کورنگی میں تعینات ہوئے جہاں ایئر فورس کے کالج آف ایرونا ٹیکل انجینئرنگ میں ایئر فورس کے انجنیئرز کو تعلیم دی جاتی تھی۔ اس ونگ میں بطور انتظامی امور، سپروائزری اسٹاف تعنیات ہو کر کیڈٹس کو تربیت دیتے رہے۔ زندگی کے ان ہی شب و روز میں مصروف وہ اپنے پیشہ اور گھریلو ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مصروف رہے۔ وہ 1967ء سے لیکر 1972ء تک پانچ سال اسی بیس پر تعینات رہے اور اپنے خانگی معاملات و دفتری مصروفیات کو ایک توازن کے ساتھ نبھاتے رہے۔ قاضی محبوب الحق کو اللہ سبحان و تعالی نے کثیر اولاد سے نوازا ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بیٹوں میں قاضی محمود الحق، قاضی اظہر محبوب اور قاضی اطہر محبوب ہیں جب کہ بیٹیوں میں شازیہ محبوب اور شہلا محبوب شامل ہیں۔

1973ء کے اوائل میں قاضی محبوب الحق کا تبادلہ پی اے ایف ایئر بیس چکلالہ اسلام آباد میں ہو گیا جہاں انھیں سی ون تھرٹی کارگو اڑانے کی ذمہ داری دی گئی۔ اسلام آباد میں قاضی محبوب الحق نے اپنی رہائش راولپنڈی کے مضافاتی علاقہ ڈھوک کھبّا میں اختیار کی۔ ایئر بیس میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ تمام آفیسران کو گھر الاٹ ہو سکیں لہٰذا ریکوزیشن پر اپنے تمام اہل و عیال کے ساتھ قاضی محبوب الحق راولپنڈی منتقل ہو گئے۔

قاضی محبوب الحق انتہائی نفیس شخصیت کے حامل انسان ہیں اور اپنے خاندان کی کفالت و پرورش میں انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھا اور اپنے دیگر رفقائے کار سے بڑھ کر اپنے کنبہ کو ضروری کو آسائشیں مہیا کیں۔

اپنے والد صاحب کو اپنے گھر بلاتے اور یہ تعلق بلاتعطّل جاری رکھتے تاکہ ان کے بچے اپنے آباء سے تعلق رکھیں۔ ان کے بچے اپنے دادا محترم کے ساتھ گذارے لمحے آج بھی یاد رکھتے ہیں اور یہ وہ بچپن کی حسین یادیں ہیں جو آج ان کے لیے سرمایہِ حیات ہیں۔ بہ طور والد قاضی محبوب الحق نے اپنے کیریئر کو اپنی اولاد پر قربان کیا اور ایک ایسا موقع جو انہیں اپنے کیریئر کی بلندی پر لے جاتا ،انھوں نے صرف اس لیے چھوڑ دیا کہ کہیں ان کے بڑے بیٹے کو تکلیف نہ ہو۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ قاضی محبوب الحق کو 1980ء میں اسٹاف کالج کورس کرنے کا موقع ملا۔ ان دنوں یہ رواج تھا کہ کوئی ایک افسر جو ایئر فورس سے تعلق رکھتا ہو یا نیوی سے، وہ ایئر فورس کا یہ کورس کر سکتا تھا۔اُن دنوں اِس تربیتی کورس میں ایران، عراق، ملائیشیا و دیگر عرب ممالک کے فوجی افسران بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ قاضی محبوب الحق بھی اس کورس کے لیے منتخب ہوئے۔ اس کورس کی کامیاب تکمیل کے بعد قاضی محبوب الحق کو کمانڈنگ رینک مل جانا تھا۔ قاضی محبوب الحق نے یہ کورس کامیابی سے مکمل کیا۔ کورس کی تکمیل کے بعدانھیں اِس شرط کے ساتھ کراچی میں پوسٹنگ کے لیے منتخب کیا گیا کہ وہ آئندہ نیول ایئر فورس کا حصّہ ہوں گے۔ قاضی محبوب الحق کے لیے یہ ایک شان دار موقع تھا کہ وہ ترقی پا کر بہتر رینکس پر پہنچ جائیں مگر ان کے بڑے بیٹے کے معالج نے انھیں واضح بتادیا کہ بیٹے کی بیماری کے پیش نظر کراچی کی آب و ہوا اُس کی صحت کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ اُس کے لیے خشک موسم موافق ہے۔ لہٰذا قاضی محبوب الحق نے ایئر فورس میں رہنے کو ترجیح دی اور نیوی میں ملنے والی ترقی کو چھوڑ دیا۔

ایسا ہی ایک قابل ذِکر واقعہ 1981ء میں پیش آیا جو اُن کی پدرانہ شفقت کو

مترشح کرتا ہے جس میں انھیں اس وقت کے ایئر چیف مارشل انور شمیم نے Deputation کے لیے منتخب کیا اور انہیں خود انتخاب کا موقع دیتے ہوئے کہا کہ وہ بہ طور ایئر اتاشی سعودی عرب یا برطانیہ چلے جائیں۔ اس وقت سعودی عرب میں ایئر اتاشی کو ڈیڑھ سے دو لاکھ روپے تنخواہ ملتی تھی جب کہ برطانیہ میں اس کا مشاہرہ پچاس سے ساٹھ ہزار روپے تھا۔ قاضی محبوب الحق کے پیشِ نظر بہترین مشاہرہ ان کے بچّوں کی تعلیم تھی۔ برطانیہ میں تین سال کی پوسٹنگ کے دوران قاضی محبوب الحق کو وہاں کے تعلیمی نظام کے بارے میں آگاہی حاصل ہوئی۔ انہیں احساس ہوگیا کہ یہ تعلیم برطانیہ کی تہذیب و تمدّن کے حساب سے تو ٹھیک تھی مگر پاکستانی نقطہ نظر سے وہ تعلیم بالکل بھی کارگر نہیں تھی۔ ان کے خیال میں برطانوی سکولوں میں مستقبل کی منصوبہ سازی کے تحت بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے جس میں فنّی اور ہنر مندی کی تعلیم پر زیادہ توجّہ تھی۔ صرف ان بچّوں کو میڈیکل یا انجینئرنگ کی تعلیم دی جاتی تھی جو ایسی تعلیم کا رجحان (Aptitude) رکھتے ہوں یا پھر مستقبل قریب کی منصوبہ بندی میں حکومت کو جتنے ڈاکٹرز، یا دیگر پیشوں کے لیے افرادی قوت کی ضرورت ہوتی تھی۔ قاضی محبوب الحق کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ پاکستان واپس جا کر ان کے بچّے کسی صورت اس تعلیم کا استعمال نہیں کر پائیں گے لہذا انھوں نے وسیع تر مفاد میں بچّوں کو ایسے پرائیویٹ سکولز میں داخل کروایا جہاں میڈیکل اور انجینئرنگ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے آپ نے تعلیمی اخراجات کی پرواہ نہیں کی۔

قاضی محبوب الحق اور ان کی اہلیہ شاہدہ بیگم نے اپنے بچوں کی اخلاقی و دینی تربیت پر توجہ رکھی۔ قاضی محبوب الحق ایک منظّم، مستعد، ذہین اور مہذب انسان ہیں۔ تہذیبی رچاؤ اور شائستگی جیسی خصوصیات ان کی شخصیت کا خاصہ ہیں تو دوسری طرف شاہدہ بیگم کی شخصیّت بھی خاندانی وقار، ادب، سخاوت اور مذہبی رجحانات سے مزّین ہے۔ ان دونوں کے زیرِ سایہ تربیت پانے والی اولاد میں یہ موروثی خصوصیات منتقل ہوگئیں۔

قاضی محبوب الحق کے والد قاضی منظورالحق ایک ماہر تعلیم تھے۔ اپنے پوتے قاضی اطہر محبوب کو اُن کے سکول کے زمانہ میں انہوں نے خود پڑھایا۔ تعلیمی میدان میں ان کی مدد کا نتیجہ تھا کہ قاضی اطہر محبوب دوسرے بچوں سے تعلیمی میدان میں ہمیشہ آگے رہے۔ وہ ہر جماعت میں اوّل آتے تھے۔ ایسے ہی بچوں کے حوالہ سے تھارن ڈائیک نے تھیوری پیش کی تھی جس کے تحت ذہانت ایک وراثتی عطیہ ہے۔ اس لیے ذہنی نشو ونما پر سب سے زیادہ اثر وراثت کا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی محبوب الحق کے بچے اپنے شخصی اوصاف Human Traits میں دوسرے بچوں سے نمایاں نظر آتے تھے۔ ان بچوں کے اساتذہ انہیں آج بھی یاد کرتے ہیں۔ پرائمری سکول کے اساتذہ اطہر محبوب کو ذہین، دوست نواز، حقیقت پسند، مستقل مزاج، زندہ دل، ملن سار، مہذب، تعاون کرنے والا، مضبوط ارادہ کا مالک اور ہنس مکھ قرار دیتے ہیں۔

قاضی محبوب الحق نے تعلیم کے شعبوں کے انتخاب کے لیے اپنی اولاد پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔ ان کی اولاد نے جس شعبہ میں جانا چاہا انھوں نے خوش دلی سے اجازت دی اور تمام ممکنہ سہولیات فراہم کرنے کی کوشش کی۔ تعلیمی مسابقت اور ذہنی بالیدگی کا یہ جذبہ مسابقت سکول، کالج اور پھر یونیورسٹی کی سطح تک ان کی اولاد کے کام آیا۔ اپنے تمام بہن بھائیوں میں سے قاضی اطہر محبوب بلا کے ذہین اور شان دار یاداشت کے مالک ہیں۔ بہترین تعلیمی پس منظر کے ساتھ ساتھ اطہر محبوب ایک اچھے مقرر بھی ہیں۔

قاضی اطہر محبوب اپنے ہم عصروں میں تعلیمی مسابقت کے حوالے سے قابلِ رشک رہے ہیں۔ ان کے ایک ہم عصر فرحان رانا جو اس وقت امریکہ کی ایک مشہور یونیورسٹی کارنیل میں ایک سائنسدان کے طور پر کام کر رہے ہیں ان کے تعلیمی حریف رہے ہیں۔ فرحان رانا کے بھائی قاضی اطہر محبوب کو ملنے IB آئے اور کہا کہ میں آج انہیں خاص طور پر ملنے آیا ہوں کہ اس فطین کو تو ملوں جس نے میرے بھائی پر علمی برتری حاصل کی اور اسے اس کی کلاس کی اول پوزیشن سے محروم کر دیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ اوائل کلاسز میں بھی پیش آیا جب ایک کلاس فیلو ارحم رشید جو قاضی اطہر محبوب کے سکول میں داخلہ لینے سے پہلے ہر جماعت میں اوّل آتی تھی۔ قاضی اطہر محبوب کے آنے کے بعد دوئم آنا شروع ہوگئی۔ ارحم رشید کے بڑے بھائی رضوان کو یہ بات پسند نہ آئی اور وہ اکثر قاضی اطہر محبوب کو دھمکاتا۔ وہ مختلف حیلے بہانوں سے کلاس میں آکر اپنی بہن کی برتری کو اجاگر کرتا رہتا تھا۔ پانچویں کا ایک اور ہم جماعت ارسلان فاروق بھی بہت ذہین تھا اور ہر کلاس میں اوّل رہتا۔لیکن پھر بورڈ امتحانات میں قاضی اطہر محبوب اوّل قرار پائے اور وہ دوئم پوزیشن پر آیا۔ اس وقت ارسلان فاروق بھی امریکہ میں ہے اور Silicon Valley میں ان کی اپنی کئی کمپنیاں ہیں اوراعلیٰ پائے کے کاروباری افراد میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔ارسلان فاروق کے مقالات دنیا کے مشہور جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اطہر محبوب کے ابتدائی تعلیمی دور میں اس وقت ایک چھوٹا سا وقفہ آیا جب ان کو ہیٹ اسٹروک ہوا اور ان کے ہاتھ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ اس سے ان کی تعلیمی پوزیشن پر خاصا اثر پڑا مگر یہ کیفیت چند ماہ سے زیادہ نہ رہی اور اپنے فریکچر کے ٹھیک ہوتے ہی وہ دوبارہ اپنی پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ قاضی اطہر محبوب کی ان کاوشوں کی اصل وجہ ان کے والدین اور اس کے بعد اساتذہ کرام رہے جن کی توّجہ، پذیرائی، محبت، شاباشی اور خود ان کا ذوقِ مطالعہ تھا جس نے انھیں ہر علمی میدان میں آگے رکھا۔ اطہر محبوب کی علمی تربیت میں ان کے پٹارو کالج میں ریاضی کے استاد زمان صاحب اور انگریزی کے استاد حشمت صاحب کا کردار بہت نمایاں ہے۔ دیگر اساتذہ بھی انکی قابلیّت کی وجہ سے انتہائی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ ان اساتذہ کی تربیت کا ہی اثر ہے کہ اطہر محبوب نے تعلیمی میدان میں سبقت برقرار رکھی۔ انھیں اپنے اساتذہ سے یہ بھی سیکھنے کو ملا کہ کس طرح کا استاد نہیں بننا چاہیے اور کس طرح بہتر استاد بنا جا سکتا ہے۔

پرائمری کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے ان کی ایک استانی مسز سلطان انہیں حرفِ

تنقید بناتی تھیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ اطہر بہت زیادہ ذہین بننے کی کوشش کرتا ہے اور ہر سوال کا جواب دیتا ہے۔ اس عمر میں بچے کی حساسیت بہت زیادہ ہوتی ہے اور ایسی باتوں سے ان کی تعلیمی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ اطہر محبوب پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس قسم کا استاد کبھی نہیں بنیں گے۔

ایک مرتبہ چوتھی جماعت میں اطہر محبوب کو تیز بخار ہوا اور وہ جماعت میں اپنی پوزیشن برقرار نہ رکھ سکے مگر حیرت کی بات یہ ہوئی کہ مسز سلطان نے نتیجہ کا اعلان کرتے ہوئے اول، دوم اور سوم آنے والے بچوں کی تعریف کرنے کے بجائے اطہر محبوب کی تعریف کی جو چوتھے نمبر پر آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بچہ لائقِ تحسین ہے جس نے اپنے زخمی ہاتھ اور شدید علالت کے باوجود اپنا پرچہ بہت اچھے طریقہ سے حل کیا۔

انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب جب خود استاد بنے تو انھوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ وہ ہمیشہ اپنے طلباء کے ساتھ شفقت و محبت کے ساتھ پیش آئیں۔ سرسید یونیورسٹی کراچی میں تدریس کے اوائل دنوں میں انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کے ایک شاگرد فیصل کریم نے اس وقت سخت بدتمیزی کی جب انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب بورڈ پر لکھنے میں مصروف تھے۔ انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب نے بدتمیزی کرنے والے طالب علم کی طرف دیکھا اور بغیر کوئی ردّعمل دیئے اپنی کلاس مکمل کی۔ پوری کلاس حیران تھی کہ استادِ مکرّم نے کچھ بھی نہیں کہا جب کہ ایسی صورت میں کسی بھی استاد کا اضطراری فعل یہ ہوتا کہ وہ کلاس کا بائیکاٹ کرتے اور اس وقت تک کلاس میں نہ آتے جب تک کہ پوری کلاس معذرت نہ کرلیتی مگر یہ انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب نے ایسا کوئی جوابی ردّعمل نہیں دیا۔ اُسی دن شام ۴ بجے وہی لڑکا اطہر محبوب کے پاس آیا اور اپنی غلطی تسلیم کرکے روتے ہوئے معافی مانگی۔

قاضی اطہر محبوب کا پہلا سکول فرانس میں تھا جہاں سے انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد کراچی اور پشاور کے سکولوں میں تعلیم پائی۔ قاضی محبوب

الحق فوجی افسر تھے اس لیے جہاں بھی ان کی پوسٹنگ ہوتی۔ ان کے بچے انکے ساتھ جاتے تھے۔ قاضی اطہر محبوب نے اے لیول امریکہ میں مکمل کیا اور اس کے بعد کیڈٹ کالج پٹارو سے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ 1988ء میں قاضی اطہر محبوب اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مرتبہ پھر امریکہ کے لیے روانہ ہوئے جہاں ان کے بڑے بھائی پہلے سے ہی زیرِ تعلیم تھے۔

قاضی محمود الحق

قاضی محبوب الحق کے سب سے بڑے بیٹے قاضی محمود الحق ہیں ۔ ان کی پیدائش 1968ء میں لاہور میں ہوئی۔ چوں کہ قاضی محبوب الحق پاکستان فضائیہ میں شمولیت اختیار کر چکے تھے اور فوج کی ملازمت میں مختلف اسٹیشنز پر تعیناتی ہوتی رہتی تھی۔ اس وقت ان کے والدِ گرامی، لاہور گڑھی شاہو سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے ۔اس لیے قاضی محبوب الحق اپنی منکوحہ کو بیاہ کر لاہور لائے جہاں وہ کچھ عرصہ تک قیام پذیر رہے اور ان کے بڑے بیٹے قاضی محمود الحق کی ولادت لاہور میں ہوئی۔ قاضی محمود الحق کا عقد مہوش بی بی سے 1997ء میں ہوا اور ان کے ہاں چار بچوں کی ولادت ہوئی جن میں ان کے ہاں سب سے پہلے بیٹی نے جنم لیا جس کا نام ماریہ رکھا گیا اس کے بعد ان کے ہاں دوسری بیٹی کی ولادت ہوئی جن کا نام محسنہ ہے۔ تیسرے نمبر پر بیٹا پیدا ہوا جس کا نام مامون تجویز ہوا اور سب سے چھوٹی بیٹی کا نام مومنہ رکھا گیا۔ قاضی محبوب الحق کی شدید خواہش تھی کہ ان کی اولاد ڈاکٹر یا انجینئر بنے مگر انھوں نے اپنی اولاد کو کبھی بھی اپنی خواہش کے تابع نہیں کیا۔ ان کی اولاد نے جو بھی شعبہء زندگی منتخب کیا ان کے والد نے اُسے خوشدلی سے قبول کر لیا تا کہ ان کے بچے اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی گذار سکیں۔ چناں چہ قاضی محمود الحق نے اپنے لیے شعبہ کمپیوٹر کا انتخاب کیا اور امریکہ سے اس شعبہ میں اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کی اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ امریکہ میں شعبہ آئی ٹی سے منسلک ہیں۔

قاضی محمود الحق کا تخصص (Cyber Security) ہے۔

قاضی اظہر محبوب

قاضی محبوب الحق کے دوسرے بیٹے قاضی اظہر محبوب کا نکاح 1996ء میں شازیہ سے ہوااور ان کے ہاں پانچ بیٹے اور بیٹیوں کا جنم ہوا۔ قاضی اظہر محبوب کے سب سے بڑے بیٹے کا نام عمر ہے ۔ دوسرے بیٹے کا نام عثمان ہے جن کے بعد ان کے ہاں جڑواں بچیوں نے جنم لیا۔جن کے نام علی الترتیب ثوبیہ اور صالحہ رکھے گئے ۔اُن کے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام علی ہے۔ قاضی اظہر محبوب کا رجحان کامرس کی طرف تھا۔انھوں نے BBA کیا اور بہتر مستقبل کے پیش نظر امریکہ منتقل ہو گئے ۔ قاضی اظہر محبوب نے امریکہ کی ساحلی ریاست فلوریڈا میں سرکاری ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا مگر طبیعت میں تجارت سے دلچسپی زیادہ تھی لہذا سرکاری ملازمت چھوڑ کر اپنا کاروبار شروع کیا اور آج ایک کامیاب کاروباری شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔

انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب

قاضی محبوب الحق کے تیسرے بیٹے قاضی اطہر محبوب 13 جنوری 1971 میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کم عمری میں ہی تعلیم وترقی کی منازل طے کیں ۔ اطہر محبوب کی شادی ان کی خالہ زاد رابعہ اطہر سے 27 ستمبر 1997ء میں ہوئی اور ان کو اللہ نے پانچ بچوں سے نوازا جس میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ سب سے بڑی بیٹی کا نام رملہ محبوب ہے جو 22مارچ 1999ء میں پیدا ہوئیں ان کے بعد اللہ تعالی نے اولادِ نرینہ سے نوازا جن کا نام عمار محبوب رکھا گیا۔عمار محبوب کی تاریخ پیدائش 2 ستمبر 2000ء ہے۔ عمار محبوب کے بعد رمشا محبوب پیدا ہوئیں جن کا سنِ ولادت 25 ستمبر 2002ء ہے۔

ارسلان محبوب چوتھے نمبر پر ہیں اور ان کی پیدائش 28 اپریل 2005ء میں ہوئی اور سب سے چھوٹی بیٹی فرح محبوب 27 دسمبر 2010ء میں پیدا ہوئیں۔

قاضی اطہر محبوب بھی اپنے والدین کی طرح اپنے بچوں کی بھرپور تعلیمی نشوونما کے قائل ہیں اور اس میں انہیں اپنی زوجہ رابعہ محبوب کا مکمل تعاون حاصل رہا۔ سب سے بڑی بیٹی رملہ محبوب اس وقت فلوریڈا اسٹیٹ یونیورسٹی (امریکہ) سے بی ایس کی تعلیم مکمل کر رہی ہیں ۔ جب کہ عمار محبوب براڈر اسٹیٹ یونیورسٹی امریکہ سے الیکٹریکل انجینئرنگ میں بی ایس کر رہے ہیں ۔ تیسرے نمبر پر بیٹی رمشا محبوب فلوریڈا یونیورسٹی امریکہ سے بی ایس کمپیوٹر سائنسز کر رہی ہیں۔ چوتھے نمبر پر ارسلان محبوب ہیں وہ بھی امریکہ میں ہی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ چاروں بچے امریکہ میں اکٹھے اپنے دادا اور دادی کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی فرح محبوب اس وقت اپنے والدین کے ساتھ بہاول پور میں مقیم ہیں اور روٹس سکول کی طالبہ ہیں۔

انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کا تفصیلی ذکر ایک الگ باب میں آگے آئے گا۔

شازیہ محبوب

قاضی محبوب الحق کی صاحبزادی شازیہ محبوب 1973ء میں پیدا ہوئیں ۔ ان کی شادی نجیب الدین واصف سے 1993ء میں ہوئی ۔ وہ کراچی کے علاقہ اسکیم ون میں سکونت پذیر ہیں ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ نجیب الدین واصف کا کاروبار شادی بیاہ کے کپڑوں کی فروخت کا ہے۔ ان کا کاروبار کافی وسیع ہے اور وہ ایک متمول کاروباری شخصیت ہیں۔ ان کی دکانیں طارق روڈ پر ہیں۔ شازیہ واصف کی سب سے بڑی بیٹی کا نام وجیہ ہے۔ وجیہ نے بی ایس کیا ہے اکاؤنٹنگ اور فنانس میں اور آج کل داؤد ہرکولیس اینڈ گروپ کی کمپنی میں ملازمت کرتی ہیں۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی عبداللہ نے قانون کی ڈگری حاصل کی اور وہ یونیورسٹی آف لندن کا ایک پروگرام ZABIST سے

مکمل کر چکے ہیں۔ بی ایس اکاؤنٹنگ اور فنانس IBA سے مکمل کر رہے ہیں۔ تیسرے نمبر پر ان کا بیٹا غفران ہے جنھوں نے اے لیول مکمل کیا اور IBOM کراچی سے کر رہے ہیں اور پانچواں بیٹا حماد ابھی او لیول میں ہے۔

شہلا محبوب

قاضی محبوب الحق کی دوسری صاحبزادی اور سب سے چھوٹی بیٹی شہلا محبوب 1977ء میں پیدا ہوئیں اور ان کی شادی تجمل تاج الدین سے ہوئی جو صرافہ کے کاروبار سے منسلک ہیں۔ ان کی رہائش کراچی میں ہے اور ان کی اولاد میں ایک بیٹی اور ایک بیٹا شامل ہیں۔ بڑی بیٹی ثناء نے انڈس ویلی سکول آف آرٹس اینڈ آرکی ٹیکچر سے انٹیریر آرکیٹیکچر میں اپنی ڈگری مکمل کی ہے۔ ان کے بیٹے سعود نے حال ہی میں او لیول مکمل کیا ہے۔

رابعہ اطہر زوجہ اطہر محبوب

رابعہ اطہر (خالہ زاد اطہر محبوب) کا عقد انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب سے ان کی والدہ محترمہ کی پسند سے ہوا اور اپنی والدہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے قاضی اطہر محبوب نے سرِ تسلیم خم کیا اور یوں ان کی شادی کراچی میں انجام پائی۔ رابعہ محبوب کی تین بہنیں اور ایک بھائی پر مشتمل خاندان ہے۔ ان کی بڑی بہن کا نام شبانہ عرفان ہے اور ان کی شادی میاں عرفان احمد سے ہوئی ہے۔ ان کا بڑا بیٹا نبیل عرفان ہے۔ نبیل عرفان نے COMSAT سے بی ایس الیکٹریکل انجینئرنگ کی ہے اور اس وقت لاہور میں ایک سوفٹ ویئر کمپنی میں ملازمت کر رہے ہیں۔ نبیل عرفان سے چھوٹی ان کی ایک بیٹی ہے جن کا نام میمونہ عرفان ہے ان کی شادی کراچی میں ہو چکی ہے اور تیسرے نمبر پر بیٹا ہے جن کا نام راغب عرفان ہے۔ راغب عرفان نے یونیورسٹی آف لاہور سے بی ایس ایوی ایشن

ٹیکنالوجی میں کیا ہے۔ میمونہ عرفان اور ان کی فیملی لاہور میں رہتے ہیں ۔

رابعہ محبوب کی دوسری بہن سبینا عامر ہیں جن کی شادی عامر سے ہوئی۔ عامر فوج سے بریگیڈئر کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں اور اس وقت NUST میں کام کرتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی بیٹی سارہ ہے اور سارہ کی شادی فوجی آفیسر حسیب سے ہوئی ہے ۔ یہ اس وقت اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ سبینا عامر کا دوسرے نمبر پر ایک بیٹا ہے جو جرمنی سے MBA کر رہا ہے ۔ تیسرے نمبر پر حمزہ عامر ہے جو اس وقت بحریہ یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنسز میں اپنی ڈگری کو مکمل کر رہے ہیں۔ ان کی چوتھی بیٹی کا نام آمنہ عامر ہے جو بحریہ سے اپنی ڈگری فنانس میں مکمل کر رہی ہیں۔ رابعہ محبوب کی تیسری بہن کا نام سعدیہ اکبر ہے جو اس وقت کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔ سعدیہ اکبر کے شوہر کا نام اکبر خان عرفانی ہے۔ ان کے چار بچے ہیں۔ سب سے بڑی بیٹی کا نام مریم اکبر ہے جو اس وقت ZABIST سے ایم بی اے کر رہی ہیں۔ ان کی دوسری بیٹی کا نام خدیجہ اکبر ہے جو بقائی میڈیکل یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ عثمان اکبر انکا تیسرا بیٹا ہے جو اسوقت اے لیول کر رہا ہے۔ چوتھے نمبر پر ان کی بیٹی ہے جس کا نام نور اکبر عرفانی ہے اور وہ جماعت نہم میں زیرِ تعلیم ہیں۔

باب پنجم

بہاول پور

سقوط بغداد 1258ء کے بعد عباسی خلفاء کی سلطنت کا شیرازہ بکھرا اور عباسی خاندان ہجرت کرتے ہوئے مصر کی طرف نقل مکانی کر گیا۔ مصر سے وہ سندھ آئے اور مکران (بلوچستان) میں آباد رہے۔ سندھ میں عباسیوں کو پہلے پہل تو مذہبی پیشوائی ملی مگر وقت کے ساتھ اس قبیلہ کے جانشین نواب اور زمیندار بن گئے۔ بعد ازاں سندھ کے اندرونی حالات اور سیاسی و سماجی ابتری نے انہیں سندھ کا حکمران بنا دیا۔ ریاست بہاول پور کے تاریخی پس منظر کا آغاز عباسی خاندان کے چشم و چراغ امیر چوانی خان سے ہوا جن کے پاس اعزازی طور پانچ ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ تھا۔ ان کی خدمات اور جرات و بہادری کے عوض ابڑو سے لے کر لاہوری تک کے علاقہ کی کمان انہیں دی گئی تھی۔ میر چوانی خان کے دو بیٹے تھے امیر مہدی خان اورا میر داؤد خان۔ امیر چونی خان کی وفات کے بعد ان کا منجھلا بیٹا امیر مہدی خان ان کا جانشین بنا مگر وہ جلد وفات پا گیا۔ میر مہدی خان کی جلد وفات کے بعد عنان حکومت امیر ابراہیم خان نے سنبھالی۔ اُن کے دور میں یہ خاندان پورے سندھ پر حکمرانی کرنے لگا۔ امیر داؤد خان کا سکّہ بہاول پور کے علاقہ تک چلنے لگا۔

اگر ریاست بہاول پور کا بانی امیر داؤد خان کو کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ وہ سندھ سے اُچ شریف آ کر آباد ہوئے۔ اُچ شریف کے پیر گجلانی اور پیر بخاری کے کہنے پر

ملتان کے گورنر نواب حیات اللہ ترین نے عباسی خانوادے کو ایک علاقہ، جسے چندسری کے نام سے پکارا جاتا تھا، بہ طور تحفہ عطا کیا۔ یوں ریاست بہاول پور 1727ء میں وجود میں آئی جس کے پہلے حکمران محمد بہاول خان اوّل (1727-1746) بنے اور انھی کے نام کی مناسبت سے اسے بہاول پور پکارا جانے لگا۔ اُن کا مزار قبرستان ملوک میں ہے۔ محمد بہاول خان امیر داؤد خان کے جانشیں تھے۔ گورنر نواب حیات اللہ خان نے امیر داؤد کو یہ رقبہ مغل سلطنت کی طرف سے ان کی فوجی مدد کے عوض انعام کے طور پر عطا کیا تھا۔ بعد ازاں نواب صادق اوّل نے اپنی سپاہ گری سے مزید علاقہ فتح کیا اور اسے ریاست بہاول پور کا حصّہ بنایا۔ نواب صادق اوّل نے الہٰ آباد کو اپنا دارالخلافہ تجویز کیا جو چاندسری کے قریب واقع تھا۔ یہی علاقہ ریاست بہاول پور کا سب سے پہلا دارالخلافہ بنا۔ عباسی داؤد پوترے، تواتر سے فتوحات حاصل کرتے گئے اور قرب و جوار کے سارے علاقہ کو زیرِ نگیں کرنے کے بعد مستقل بنیادوں پر ریاست بہاول پور کی داغ بیل ڈالی۔

اس وقت ڈیرہ غازیخان میں نادر شاہ درّانی (1736-1747) کی حکومت تھی۔ نواب صادق اوّل نے درانیوں سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے بعد انھیں نواب کا خطاب ملا اور ان کی حکمرانی شکارپور، لاڑکانہ، سویستان چتّر، چندانی اور دراوڑ تک پھیل گئی۔ اس کے بعد مبارک پور، سرگودھا، خیر پور اور کوٹ سبزل کی بنیادیں ڈالی گئیں۔ ان قرب و جوار کے علاقوں کو فتح کرنے میں نواب صادق اوّل کو کچھ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا مگر اپنی بہترین فوجی حکمت عملی سے نواب صادق اوّل نے کامیابی حاصل کر لی۔ اسی بہتر تدبیر کی وجہ سے نواب صادق اوّل نے پاک پتن، دنیا پور، کہروڑ پکّا اور میلسی تک کے حصّہ کو اپنی ریاست کا حصّہ بنا لیا۔

ریاست بہاول پور کے فرمان رواؤں کو ہمیشہ سے ہی بیرونی حملوں اور دوسری ریاستوں کی شورشوں کا سامنا رہتا تھا۔ اس لیے بہاولپور شہر کی منصوبہ سازی کرتے وقت فوجی لائحہ عمل کو پیشِ نظر رکھا گیا۔ شہر بہاول پور کو دریائے ستلج کے جنوبی کنارہ پر بسایا گیا۔

دفاعی نقطہ نظر کے تحت شہر کے ارد گرد ایک حفاظتی فصیل تعمیر کی گئی۔

نواب صادق محمد خان ایک اعلیٰ منتظم اور ماہر جرنیل تھے۔ ان کی حکمرانی میں ریاست بہاول پور نے بہت وسعت حاصل کی۔ ان کے بعد تاج حکمرانی ان کے جانشینوں مبارک خان عباسی (1749-1772) اور امیر محمد خان عباسی (1772-1809) کو ملا۔ جنھوں نے اپنے اجداد کی طرح ریاست بہاول پورکو مزید بہتر بنایا۔ ان کے بعد حکمرانی کا ہما نواب بہاول خان سوئم (1805-1852) کے سر سجا، بدقسمتی سے اس دور کو ریاست کا دورِ ابتلا کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ مہاراجہ رنجیت سنگھ تھا۔ اس دور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے جرنیل ونتورا کو بھیج کر ریاست بہاول پور کی وسعت کو محدود کر کے بہاول پورر شہر کو تباہ کر دیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ان ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر نواب بہاول خان سوئم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور 1832ء میں باہمی دوستی کی ایک یادداشت پر معاہدہ طے پایا جس کے تحت کمپنی سرکار ریاست بہاول پور کے تحفظ، بقاء اور خودمختاری کی ضامن بنی۔

اس معاہدہ کے نتیجہ میں پاک پتن، لودھراں، میلسی، کہروڑ پکّا، مظفرگڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے علاقوں کو پولیٹیکل ایجنٹ کے زیر نگرانی دے دیا گیا جو وہاں کے ریاستی امور کو چلانے لگے۔ شاہی دربار بہاول پور کے ساتھ کام کرنے لگا۔ اس معاہدہ کے تحت برطانوی حکومت نے نواب بہاول خان سوئم کو فوجی کمک بھی فراہم کی تاکہ وہ دیوان مول راج کے خلاف جنگ کر سکیں۔ نواب بہاول خان سوئم، برطانوی کمانڈر سر ایڈورڈ ہربرٹ اور لارڈ ڈلہوزی کے ہمراہ 23000 کی فوج کے دشمن پر حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے دیوان مول راج گورنر ملتان کو 1848ء میں شکست دے دی۔ برطانوی حکومت اس فتح پر بہت خوش ہوئی۔ نواب بہاول خان سوئم کو ایک لاکھ روپیہ سالانہ انعام اور ہر سپاہی کو 100 روپیہ نقد انعامات سے نوازا۔

تاجِ برطانیہ، نواب بہاول خان سوئم سے بہت خوش تھا۔ برطانیہ کی نوازشات کی

بارش نواب بہاول خان سوئم کی زندگی تک جاری رہیں۔ نواب بہاول خان سوئم 1852ء میں انتقال کر گئے ۔ آپ کے جاں نشین نواب فتح خان (1858-1866) تخت نشین ہوئے۔ نواب فتح خان چہارم کے دور میں جنگِ آزادی (1857) لڑی گئی جس میں نواب فتح خان چہارم نے برطانوی سامراج کا ساتھ دیا۔ نواب فتح خان چہارم کی موت کے بعد نواب بہاول خان (1858-1866) نے جانشینی سنبھالی ۔ان کا دور حکومت انتہائی مختصر رہا اور نواب بہاول خان 1866ء میں خالقِ حقیقی سے جا ملے، ان کے بعد ان کے کم سن بیٹے نواب صادق محمد خان نے عنانِ حکومت سنبھالی مگر داؤد پوترا خانوادے کی باہمی چپقلشوں اور مسائل نے اس کم سن نواب کے لیے خطرہ کی گھنٹی بجا دی۔ قریب تھا کہ خاندانی دشمنی اس کم سن نواب کیلئے کوئی سنگین خطرہ بنتی، ان کی جہان دیدہ والدہ نے برطانوی حکمرانوں سے مدد کی اپیل کر دی جس پر 1866ء میں کمشنر ملتان جناب فورڈ کو سلطنت برطانیہ کی طرف سے بہاول پور بھیجا گیا تا کہ وہ کم سن نواب کے جوان اور ذی شعور ہونے تک معاملات سلطنت سنبھال سکیں۔ ایجنسی کا یہ دورِ حکومت بہاول پور کا سنہری دور تھا جہاں ریاست بہاول پور دفتری انتظامات میں ایک نئے اصطلاحاتی عہد میں داخل ہوئی اور برطانوی طرز پر اداروں کی بنیاد رکھی گئی ۔عوامی فلاح و بہبود کے لحاظ سے یہ دور انتہائی شان دار تھا۔ 1887ء میں خواتین کے لیے ایک زنانہ ہسپتال بنایا گیا جہاں برطانیہ سے گائنا کالوجسٹ خواتین کا علاج کرتی تھیں۔ 1886ء میں ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ کی بنیاد رکھی گئی جسے آج بھی صادق ایجرٹن کالج کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

نواب بہاول خان پنجم (1903-1907) کے دور میں بہاول وکٹوریہ ہسپتال کا بڑا منصوبہ شروع ہوا جسے 1906ء میں مکمل کر لیا گیا ۔ اسی سال ایک یتیم خانہ اور بہاول کلب بھی تعمیر ہوئے۔ نواب بہاول خان پنجم ہر شہر میں جاتے اور تمام سرکاری امور کی خود نگرانی کرتے تھے۔ 1901ء میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی نواب بہاول خان پنجم نے لینڈ ریونیو ریکارڈ کے امور اپنی نگرانی میں لے لیے۔ نواب بہاول خان پنجم

1907ء میں حجازِ مقدس سے فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد لوٹ رہے تھے کہ راستہ میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ اگر نواب بہاول خان پنجم مزید کچھ عرصہ حیات رہتے تو شاید وہ سب سے بہترین حکمران گردانے جاتے۔

نواب بہاول خان پنجم کی رحلت کے بعد کاروبارِ حکومت نواب سر صادق محمد خان پنجم (1907-1955) کو ملا۔ ان کی کم سنی کی وجہ سے ایک ریجینسی تجویز کی گئی۔ نواب صادق محمد خان پنجم نے اپنی تعلیم چیف کالج لاہور سے حاصل کی اور انھیں حکومتی امور کی سپردگی 8 مارچ، 1924ء میں سونپی گئی۔ نواب صادق محمد خان پنجم نے 1930ء میں مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کے اجلاس کی صدارت کی اور جامعہ ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم کا ہدیہ دیا۔ نواب صادق محمد خان پنجم نے 1935ء میں حج کا فریضہ ادا کیا اور خادمین حرمین شریفین شاہ عبدالعزیز بن سعود کے مہمان رہے۔ نواب صادق محمد خان پنجم ایک فیاض نواب تھے آپ نے 1935ء میں کوئٹہ کے زلزلہ زدگان کی دل کھول کر امداد کی۔ بادشاہ جارج ششم کی تاجپوشی کے موقع پر نواب صادق محمد خان پنجم چھ سو مہمانوں میں سرِفہرست تھے جنھیں اس رسمِ تاج پوشی میں مدعو کیا گیا تھا۔

نواب صادق محمد خان پنجم ایک ہمہ جہت شخصیّت کے مالک تھے۔ آپ کی منصوبہ سازی کی دلیل بہاول پور میں خوب صورت عمارات کی صورت میں موجود ہیں جن میں قابلِ ذکر اسلامیہ یونیورسٹی کے عباسیہ کیمپس کی شان دار بلڈنگ، ہسپتال اور سب سے بڑھ کر ان کا کارنامہ ستلج ویلی پراجیکٹ (1932-33) ہے۔ اس پراجیکٹ کے تحت ہی تین مختلف مقامات پر ہیڈ ورکس کی تعمیر ممکن ہو پائی جس سے ریاست بہاولپور میں نہروں کا جال بچھ گیا اور ایک اعشاریہ پانچ ملین چولستانی صحرائی زمین سیراب ہونا شروع ہوئی۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود!

رئیس الجامعہ انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب (تمغہ امتیاز)

انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب (تمغہ امتیاز) کو جو ترکہ اپنے آباء سے ملا وہ جذبہء حب الوطنی، علم دوستی، انسان دوستی اور پاکستانیوں سے لازوال محبت ہے۔ انکا مطمع نظر پاکستان اور پاکستانیوں کی ترقی ہے۔ وہ با آسانی امریکہ کی کسی بھی بہترین یونیورسٹی میں ملازمت کر کے ایک آسودہ زندگی گذار سکتے تھے مگر ان کی اوّلین ترجیح ان کا ملک، اور ان کے لوگ ہیں۔ ان کے تمام دوست اس وقت بیرون ملک بین الاقوامی سطح پر نام کمارہے ہیں ۔ جب کہ انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب نے اپنے آباء کی طرح اور ان کی تربیت کی لاج رکھتے ہوئے انفرادی کی بجائے اجتماعیت پسندی کی سوچ کو اپنایا۔ وہ اپنی ذات اور شخصیّت سے ہٹ کر انسانیت کی ترقی و ترویج پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ لوگوں کے آگے بڑھنے کے لیے راستوں کو آسان بنائیں۔ ان کی سوچ "مَیں" نہیں بلکہ "ہم" ہے۔ وہ ذاتی مفاد سے ہٹ کر ملکی و قومی مفادات کو عزیز رکھتے ہیں۔ جب کہ عمومی طور پر اس سطح کے لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر انہیں بیرونِ ملک مواقع دستیاب ہیں تو پاکستان میں رہ کر کم مالی منفعت پر کیوں کام کریں۔ انھوں نے اپنی مالی مفاد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جدوجہد کی اور پاکستان میں جہاں ایک سائنٹسٹ کو اپنی جگہ بنانا مشکل ہے اور کئی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں انھوں نے مشکل راہ کو چنا اور ایک بہترین

منتظم کے طور پر خود کو منوایا۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے دو پبلک یونیورسٹیوں کی سربراہی کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ خواجہ فرید یونیورسٹی کا وجود صرف کاغذوں کی حد تک تھا۔انہوں نے اپنے چار سالہ دور میں ایک مکمل اور جدید کیمپس تعمیر کروایا، شعبوں کی تعداد میں اضافہ کیا اور ایک مستحکم جامعہ کی بنیاد رکھ کر اگلی جامعہ کے سفر کی جانب روانہ ہوئے۔ ان کی اگلی منزل بہاول پور کی جامعہ اسلامیہ تھی۔

وائس چانسلر شپ پاکستان میں پھولوں کا بستر نہیں بلکہ کانٹوں کی سیج ہے جبکہ باہر بیٹھے سائنسدان اور ماہرینِ تعلیم صرف اسی وجہ سے پاکستان میں آنے سے ڈرتے ہیں کہ وہ اپنی پرسکون زندگی کو مشکل میں کیوں ڈالیں۔ مگر ڈاکٹر اطہر محبوب امریکہ سے پاکستان واپس تشریف لائے اور مشکل راہ پر اپنی عملی زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔اب مستقل پاکستان کی تعمیر و ترقی میں مصروفِ عمل ہیں۔

اطہر محبوب کی شخصیت کے کئی اہم پہلو ہیں۔وہ راہ میں در پیش مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیّت رکھتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے لے کر زمانہ معلّمی تک مختلف ادوار میں انھوں نے اپنی ان صلاحیتوں کو منوایا۔ان کی شخصیت کا سحر اور دل موہ لینے والا اندازِ گفتگو دیکھنے اور سننے والے پر اثر کرتا ہے۔ جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو خیال کا تسلسل مجروح نہیں ہوتا اور وہ سامع کو قائل کر لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی شخصیّت میں یہ پہلو بچپن میں فنِ تقریر پر ملکہ حاصل کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں بہ حیثیت مقرّر ہمیشہ اوّل آتے رہے اور اپنے سکول و کالج کے زمانہ میں کئی ایوارڈز اپنے نام کیے۔ یہ وصف انہیں زبانی ابلاغ میں ہی نہیں بلکہ انگریزی و اردو دونوں زبانوں میں تحریر پر بھی حاصل ہے۔ وہ بیک وقت ان دونوں زبانوں میں مشاق ہیں۔وہ دور طالبعلمی میں بھی اردو مضمون نگاری اور انگریزی میں ایڈیٹر کے نام خطوط تحریر کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تحقیق کے میدان میں تو بہت زیادہ طبع آزمائی کی اور اسی حوالہ سے تمغہء امتیاز بھی حاصل کیا۔انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے جب ڈاکٹر اطہر محبوب

نے اردو میں ایک مضمون تحریر کیا جس کا عنوان "میری پسندیدہ شخصیّت" تھا۔اس موضوع کے تحت انھوں نے اپنے دادا کے بارے میں تفصیلی مضمون لکھا تھا۔

اس وقت ان کی استاد سیّدہ زاہدہ حنا (پی اے ایف ڈگری کالج پشاور) نے بہت پذیرائی کی جو بذاتِ خود بہت اچھی مصنفہ تھیں۔ زاہدہ حنا کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ وہ ابلاغ کے نام سے ایک مجلّہ بھی شائع کرتی رہی ہیں۔ جریدہ ابلاغ کی اشاعت کے لیے محترمہ حنا کے ساتھ ان کے بھائی پروفیسر سیّد حامد سروش اور نسرین سروش بھی شریکِ ادارت رہے۔ مضافات میں بسنے والے اور نئے اہلِ قلم کو اس خاندان کی ادب پروری نصیب ہوئی۔ سیّدہ حنا، ممتاز افسانہ نگار اور اُن کے بھائی سیّد حامد سروش اعلیٰ پایہ کے شاعر، نقاد اور اُردو مضمون کے ماہرِ تعلیم تھے۔ ابلاغ نے بہت سے شعراء کرام کے خاص نمبر نکالے۔ احسان رانا (گوجرانوالہ) جو اس خاندان کی ادب پروری کی ایک درخشاں مثال ہیں۔ احسان رانا کا کہنا ہے کہ مَیں آج 6 کتابوں کا مصنف ہوں لیکن جو کچھ بھی ہوں انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کے ادب پرور اساتذہ کی ادب پروری سے ہوں۔ یہ انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں تعلیم و تربیت کے لیے وہ مؤقر اساتذہ میسر آئے جو علم و ادب کے حوالے سے مشاہیر میں اپنی خاص پہچان رکھتے تھے اور نئے لکھنے اور مضافات میں بسنے والوں کے رہنما تھے۔ ان کے علاوہ طٰہٰ خان بھی ڈاکٹر اطہر محبوب کے اساتذہ میں شامل تھے۔ جن کے ڈرامے پی ٹی وی پشاور سے نشر ہوتے تھے۔ وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ ''جواز'' ان کا شعری مجموعہ ہے۔ ایسے اساتذہ کی موجودگی اور سرپرستی میں تحریر و تقریر کے حوالہ سے ان کی تربیت ہوئی ہے۔

پاکستان کے تعلیمی نظام میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے جسے دور کرنا انتہائی لازمی ہے۔ یہ کہ طالب علم رٹی ہوئی بات کو من و عن پلٹا دیتا ہے اور اس تکرار کو علم سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اطہر محبوب ایک ایسی جدید فکر کے حامل ماہرِ تعلیم ہیں جو پاکستانی نظام کے اس

سقم کے متعلق اپنی ایک واضح رائے رکھتے ہیں اور اس کی عملی مشق وہ اپنے زیرِ انتظام اداروں میں بخوبی کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ علم نہیں بلکہ معلومات ہیں اور ہمارے یہاں اسی information پر منتج امتحان لیا جاتا ہے کہ طالبِ علم سے امتحان سے پہلے اسی معلومات کو ذخیرہ کروایا جاتا ہے اور سوال اسی پر مبنی ہوتا ہے جو کہ طالبِ علم بطور Out put کے تحریر کر دیتا ہے۔ کسی بھی Subject کے عملی اور اطلاقی پہلو کو یک سر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ آگہی کا یہ امتحان یا اس طرز پر تعلیم دینا پانچویں جماعت تک کے طلباء کے لیے تو ٹھیک ہے کہ معلومات دو اور معلومات لو مگر اس سے آگے ایسی تعلیم بھلا طالب علم کے کس کام کی۔ پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کے مطابق معلومات کو پرکھ لینے اور استعمال کرنے کا نام علم ہے۔ پاکستان میں ایسا تعلیمی نظام رائج ہے جہاں Critical Thinking and Reasoning یعنی تنقیدی سوچ اور استدلال کی کمی ہے۔ یہاں آگہی تو حاصل کر لی جاتی ہے مگر ہمارے طلباء اس بات سے واقف ہی نہیں کہ اس آگہی کا ستعمال کیسے کریں۔ اس خامی کی وجہ سے ہمارا تعلیمی نظام زوال کا شکار ہے اور وہ جذبہ پیدا نہیں ہو پا رہا جس سے کسی خاص مضمون میں ماہر پیدا ہو اور یہی وجہ ہے کہ ہمارا تدریسِ تعلیم inspiration پیدا کرنے سے قاصر ہے کیونکہ طالبِ علم جو پڑھ رہا ہے اسے اگر اس مضمون کا اطلاق سمجھ میں آ جائے تو وہ ذوق وشوق کو بڑھائے گا جس سے ہر طالب علم بہت آگے جا سکتا ہے ایسے میں اس کی ترقی کو کوئی روک نہیں پائے گا۔

اس کے علاوہ ایک اچھا استاد میسر ہو تو تعلیمی نظام میں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ ایک اچھے استاد کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ جب بولے گا تو سچ بولے گا، تمام طلباء کے ساتھ یکساں اور مساوی سلوک کرے گا۔ استاد کے قول وفعل میں تضاد نہ ہو۔ جو عزم کرے اسے پورا کرے۔ طالبِ علم اپنے استاد کی شخصیّت سے بہت متاثر ہوتے ہیں وہ ان کے لباس، ان کی بول چال اور ان کی نشست و برخاست کے انداز کو بھی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی تقلید بھی کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ایک استاد کا

کام دُہری نوعیّت کا ہے جو تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیّت بھی فراہم کرتا ہے ایسے میں ایک استاد اپنی شخصیت کے روشن پہلوؤں سے اپنے شاگرد کو متاثر کرتا ہے۔

ہر اچھا تعلیمی ادارہ خواہ وہ یونیورسٹی ہی کیوں نہ ہو، اسی صورت میں اچھا ہوسکتا ہے جب وہاں اساتذہ اور اچھے طالبِ علم ہوں باقی چیزیں جن میں infrastructure شامل ہے یہ سب ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک اچھا تعلیمی ادارہ تب بن پاتا ہے جب وہاں اساتذہ پر پڑھانے کا بوجھ کم سے کم ہو اور متعلّم اور معلم کا تناسب بہتر ہو۔ اساتذہ کو جو کام کرنے کا ماحول دیا جائے وہ conducive ہو، وہاں ذہنی اور جسمانی اذیّت نہ ہو۔ جب اساتذہ ذہنی طور پر آسودہ ہوں گے اور انہیں کوئی ہراساں نہیں کر رہا ہوگا تو وہ بہ خوشی اپنے فرائض کو سرانجام دے پائیں گے۔ اسی طرح جب طلباء و طالبات کو ایسا تعلیمی ماحول میسر ہوگا جہاں وہ خوش دلی سے آتے ہیں اور بغیر کسی بوجھ کے کام کرتے ہیں اور جو کام کرتے ہیں سیکھتے ہیں، اس کا اِطلاق جانتے ہیں تبھی ان کا علمی فریضہ تکمیل پاتا ہے ۔ اگر طالب علم صرف امتحان دینے کیلئے یا اس کی تیاری کیلئے آتے ہیں تو اسکا مطلب ہے کہ یونیورسٹی اچھا تعلیمی ماحول دینے میں ناکام رہی ہے ۔ ڈاکٹر اطہر محبوب کی کوشش رہی ہے کہ ایسا تعلیمی ماحول دیا جائے جہاں پر متعلّم کام کرنے اور سیکھنے آئیں، ان پر کوئی ذہنی و جسمانی بوجھ نہ ہو۔ جب ذہنی و جسمانی دباؤ نہیں ہوگا تو اساتذہ، طلباء و طالبات اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو دل جمعی سے انجام دینے آئیں گے۔ لائبریریاں آباد ہوں گی، گروپ ورک ہوگا، کلاسز باقاعدگی سے ہوں گی۔

اطہر محبوب کا خواب ہے کہ ہر وہ چیز جو علمی عمل کے لیے ضروری ہے، وہ یونیورسٹی میں دستیاب ہو۔ عمدہ کلاس رومز، آرام دہ فرنیچر، صاف واش رومز اور تمام دست یاب ٹیکنالوجیز درس و تدریس کیلئے مہیا کردیں اور اپنے اس اقدام کو عملی جامہ پہنانے میں وہ کوشاں رہتے ہیں۔

پاکستان میں یونیورسٹی سطح پر مخلوط تعلیمی نظام رائج ہے اور پروفیسر ڈاکٹر اطہر

محبوب کے خیال میں اس نظام میں نقائص سے بڑھ کر خوبیاں ہیں۔ معاشرتی طور پر بھی دیکھا جائے تو یہاں مخلوط نظام ہی پایا جاتا ہے اور اگر لوگوں کی رائے میں اس نظام میں نقائص ہیں تو ان یونی ورسٹیوں میں بھی مسائل ہیں جہاں مخلوط نظامِ تعلیم موجود نہیں۔ ایک مخلوط تعلیمی ادارہ میں صنفِ مخالف کی تعظیم سکھائی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس کے برعکس رویّہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس قسم کی تربیّت کا اطلاق پورے معاشرے پر ہوگا۔ اگر طلباء کی تربیت غیر مخلوط اداروں میں ہو گی تب بھی انھیں رہنا تو اسی معاشرہ میں ہی ہے، یوں ان کی تربیّت نہیں ہو پائے گی اور افرادِ معاشرہ میں انتشار پیدا ہوگا۔

اس حوالہ سے نبی اکرم ﷺ نے بھی ایسے معاشرہ کا تصور پیش کیا جہاں خواتین کو عزّت دی جائے، ان کی مجبوریوں سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ فی زمانہ آبادی کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہو چکا ہے جبکہ بچیوں کو تعلیم بھی دلوانا ہے لہٰذا پاکستان جیسے کم وسائل رکھنے والے ملک میں ہر سطح اور ہر شعبہ میں تعلیم دینے کے لیے الگ خواتین کے تعلیمی ادارے قائم کرنا ممکن ہی نہیں ہے ایسے میں اساتذہ کی ذمّہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ بچوں کی اخلاقی تربیّت پر ابتدائی جماعتوں سے ہی توجہ دیں تاکہ جب وہ مخلوط تعلیمی اداروں میں جائیں تو وہ باہمی احترام، مذہبی تقدّس اور اخلاقی اقدار کا مکمل پاس رکھیں۔ قرآن پاک کی آیات میں بھی نیکی کی رغبت کے لیے صرف مردوں کے نہیں عورتوں کے معاشرتی آداب بھی بیان ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہر معاشرے کے اپنے رسم و رواج ہوتے ہیں جب کہ ہمارے معاشرہ کے معاشی مسائل بھی الگ ہیں۔ ہمارے یہاں دیہاتوں میں عورتیں کھیتوں میں کام کرتی نظر آتی ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ ایسے معاشی حالات میں ہم عورتوں کو گھروں میں بٹھا لیں۔ متمول گھرانوں کی عورتیں کام نہیں کرتیں۔ ایسے سماجی رواج میں وقت کے ساتھ تبدیلیاں بھی رونما ہو رہی ہیں اور اسلام اس حوالہ سے مرد و زن دونوں کو خود پر پابندی لاگو کرنے کا حکم دیتا ہے جس میں ایک یقینی اخلاقیات کا کوڈ وضع کرتا ہے جس کی تعمیل لازم ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

اس اخلاقی تربیّت کے بغیر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بھی کارگر ثابت نہیں ہو سکتی۔ پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کے خیال میں تربیّت اس تعلیم کا اخلاقی اور عملی پہلو ہے جو ایک طالبِ علم حاصل کرتا ہے۔ اور علم بنا عمل کے بے سود ہے۔ اس پس منظر میں وہ علم کی چند بنیادی باتوں کو یوں بیان کرتے ہیں مثلاً علم کی پہلی سطح، "ڈیٹا" کی ہے اور دوسری سطح "آگہی" کی ہے۔ تیسری سطح علم کی ہے اور ان تینوں سطحوں پر غالب حکمت Wisdom ہے۔

تشکیلِ کردار، علم اور حکمت کے درمیان میں آتا ہے اور علم ایک فرد کو راہ نما اصول سکھاتا ہے جو اس فرد کو خود احتسابی کی طرف راغب کرتا ہے اور امر و نہی بتاتا ہے۔ان اوامر و نہی کا ذریعہ کچھ بھی ہو سکتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی، حصولِ جنت یا پھر قانون کا خوف اور جزا کا احساس وغیرہ۔ تاہم یہ راہنما اصول وضع ہوں گے تو ہی کردار تشکیل پائے گا۔ تعلیم تو صرف یہ مہارت دے گی کہ کیا چیز بنے گی اور وہ انسانیت کے لیے اور معاشرہ کیلئے کتنا سود مند ثابت ہو گی۔

سزا اور جزا کا یہ عمل فطری ہے اور معاشرہ میں باقاعدگی پیدا کرتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے خود احتسابی آتی ہے۔ دوسرے سخت نظام اور قوانین بھی ہیں جو سب سے بہتر محتسب بن جاتے ہیں اور سزا اور جزا تجویز کرتے ہیں، بغیر واضح قوانین کے اس کا حصول ممکن نہیں۔ اس کے بغیر معاشرتی انتشار پیدا ہو سکتا ہے اور اطہر محبوب کی رائے میں پاکستانی معاشرہ میں جس چیز کی کمی ہے وہ ہے قانون کا اطلاق۔ قانون کے اطلاق کے نہ ہونے کی وجہ سے معاشرتی انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ پاکستانی لوگ جذبات سے کام لیتے ہیں، جذبات میں فیصلے کرتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہاں معاملات کو objectively (معروضی) کے بجائے (موضوعی) subjectively انداز میں دیکھا جاتا ہے۔ اگر ذرا جذبات سے مبرّا ہو کر معاملات کو دیکھ لیا جائے تو شاید بہت سے مسائل کا بہتر حل نکل آئے۔ حتّٰی کہ ہمارا میڈیا بھی سنسنی خیزی پیدا کرنے میں لگا رہتا ہے۔ لوگ

میڈیا کی اندھا دھند تقلید میں تصدیق کے عنصر کو بھول جاتے ہیں اور جھوٹ کو بھی سچ سمجھ کر اختیار کر لیا جاتا ہے۔

موجودہ مادہ پرست دور میں رشتے کمزور ہو رہے ہیں۔ خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ ہم آج مادی ترقی کی دوڑ میں شامل ہو کر اقدار، رواج اور روایات کو کُلی طور پر بھول چکے ہیں۔ حتی کہ جن معاشروں نے ترقی کی منازل طے کیں اور جو نمونہ انہوں نے اختیار کیا اس سے خاندانی نظام کمزور ہوا۔ معاشی ترقی کی وجہ سے باہمی تعلق کمزور ہو گیا اور اس کے اثرات ہمارے خاندانی نظام پر پڑ رہے ہیں۔ اب وسیع خاندان کی جگہ انفرادی خاندان نے لے لی ہے۔ ہر شخص اپنے لیے فیصلہ کر رہا ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ ہم سب اپنے لیے فیصلے کر رہے ہیں، اپنی ذات کو مدّ نظر رکھ کر یا دو چار لوگوں کے مفاد کو سامنے رکھ کر سوچ رہے ہیں، کوئی بڑوں کا فیصلہ نہیں مان رہا۔ اجتماعی سوچ کی جگہ انفرادی سوچ نے لے لی ہے۔ خاندانی قالب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس کا زیادہ شکار ترقی یافتہ ملک ہو رہے ہیں اور اب پاکستان میں بھی یہی ہو رہا ہے مگران ممالک میں سے چائنہ اور جاپان ایسے ممالک ہیں جنہوں نے معاشی ترقی کی رفتار کو روکے بنا ہی اپنے Social Fabric کو بحال رکھا۔ بہ طورِ پاکستانی ہمیں بھی ایسے ہی کسی حل کو تلاش کرنا چاہیے۔ ہم اپنی روایات کو چھوڑے بنا اور اپنے اسلاف کے بنائے ہوئے سماجی نظام پر عمل پیرا ہو کر ہی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے قدم مضبوط کر کے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ہمارے اسلاف کے کردار میں وہ تمام روایات ملتی ہیں جو مثالی ہیں اور یہی روایات ترقی کی راہ کے حصول میں ہماری لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اگر دوسری اقوام میں بھی اچھی باتیں ہیں تو انہیں بھی اپنانے میں کوئی قباحت نہیں۔

مسلمان اکابرین میں بھی کچھ روایات بری رہی ہیں جیسا کہ، انتقالِ اقتدار کا پر امن طریقہ مسلم حکمرانوں میں اختیار نہیں کیا گیا۔ عصرِ حاضر میں ہی دیکھ لیجیے پاکستان میں آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں ہو پایا جس کے تحت اقتدار کے ایوانوں کو چلایا جا

سکے۔ کئی تجربے ہوئے جن میں صدارتی نظام سے لے کر مارشل لاء تک اور اب جمہوری نظام کی بساطیں بچھی ہیں مگر ان سب کے باوجود تاحال کوئی نظام بہتر انداز میں کام کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ اس سب کا حل قانون اور آئین کی پاسداری میں ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم بہتر انداز میں عنانِ حکومت اور اقتدار کے ایوانوں کو درست سمت میں چلائیں تو اس سلسلہ میں ہمیں 1973ء کے آئین کو اپنی اصلی حالت میں نافذ کرنا پڑے گا جس سے ایک خوش حال، منفعت بخش اور مستحکم حکومت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ صحت مند دماغ صحت مند جسم میں ہی پلتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب نہ صرف تحریر و تقریر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں بلکہ وہ کھیل کے میدان میں بھی اتنی مہارت کے حامل ہیں۔ انھیں اور ان کی والدہ کو کرکٹ سے بہت لگاؤ ہے اور اکثر دونوں فرصت کے اوقات میں کرکٹ میچز پر تبصرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کرکٹ کے علاوہ اسکواش اور ہاکی کے کھیل سے بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔

قریبی دوستوں کی رائے میں اطہر محبوب تنہائی پسند اور اپنی دھن میں مگن رہنے والے شخص ہیں۔ ان کے قریبی رفقاء کا خیال ہے کہ وہ پڑھنے کا شغف رکھتے ہیں اور اپنے مضمون الیکٹریکل انجینئرنگ کے ساتھ ساتھ اُردو نثر و شاعری اور تاریخ سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ حالاتِ حاضرہ سے متعلق آگہی اور نئی جہتوں میں ہونے والی تحقیق کو جاننا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ اپنا بہت زیادہ وقت جدید دور کی ٹیکنالوجی کو سمجھنے اور اس پر موجود جدید اور نئی ایجادات سے متعلق خود کو باخبر رکھنے میں بھی صَرف کرتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی میں سوشل میڈیا، یوٹیوب اور دیگر ذرائع کو استعمال کرتے ہیں۔ اردو شاعری میں انہیں علامہ محمد اقبال کا کلام بہت پسند ہے اور بہت ذوق و شوق سے ان کا کلام باقاعدگی سے پڑھتے ہیں اور کافی کلامِ اقبال انہیں زبانی یاد بھی ہے۔ ان کے طالبِ علم اور رفقاء کی رائے ہے کہ ان کی شخصیّت پر اقبال کے کلام کی گہری چھاپ ہے۔ وہ اکثر اقبال کے افکار کو پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی گفت گو اقبال کے کلام کے بغیر

ادھوری رہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں کلامِ اقبال ان کا عشق ہے۔ اقبال شناسی اور اقبال کی زندگی پر بہت درک رکھتے ہیں اور اپنے طلباء میں اقبال فہمی پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

اقبالؔ کے علاوہ غالبؔ، فیض احمد فیضؔ اور احمد فرازؔ کی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ نثر میں انہیں مقدمہ ابنِ خلدون بہت پسند ہے اور اپنے فارغ اوقات میں وہ ابنِ خلدون کو پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ فنون لطیفہ کے حوالہ سے موسیقی کو پسند کرتے ہیں اور صرف سننے کا شوق بھی ہے۔ دوسرے فنون میں مصوری کی پذیرائی کا شوق ہے مگر اُس کے متعلق کچھ زیادہ جانتے نہیں۔

انہیں دوسروں سے رائے لینا پسند ہے اور operational matters میں دوسروں کی رائے کا احترام کرتے ہیں لیکن اپنے وضع کردہ اصولوں کی جہاں پر بات آئے وہاں وہ مشاورت کے بعد جو مناسب سمجھتے ہیں وہی کرتے ہیں اور جو فیصلہ لے لیتے ہیں پھر اس پر قائم رہتے ہیں دوسرے لفظوں میں وہ جمہوری رویّہ رکھنے والے مستقل مزاج انسان ہیں۔ وہ اس کے ساتھ یہ بھی خیال رکھتے ہیں کہ صحیح رائے کا احترام کیا جائے اور جہاں ضروری ہو وہاں اپنی رائے کی تصحیح بھی کرتے ہیں۔

وہ اپنے عہدے کی ذمہ داری کو اپنی انا اور ذات پر فوقیت دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عہدہ لیا جاتا ہے تو اس کو تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔ آپ یہ نہیں کہ سکتے کہ مجھے ذاتی طور پر نہیں پسند تو میں نہیں کروں گا کیوں کہ عہدہ لیتے وقت یہ لکھا ہوتا ہے کہ آپ کے علاوہ یہ کسی اور نے نہیں کرنا، تو وہ آپ ہی کرتے ہیں اور اس میں پھر ذاتی انا کی گنجائش نہیں رہتی۔ انفرادی اور گروہی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہ سمجھتے ہیں کہ اگر گروہی مسائل کو حل کر لیا جائے تو پھر بہت کم انفرادی مسائل بچ جاتے ہیں۔ اس صورت میں اُن مستثنیات کو بعد میں بھی case to case حل کیا جا سکتا ہے۔

ان کے ذہن میں اپنے کچھ نظریات ہیں جن کے حصول کے لیے وہ موجودہ انصرام کا استعمال کرتے ہیں اور اس میں بھی ضد اور اصرار کا عنصر اس حد تک نہیں رکھتے کہ جو انھوں نے کہہ دیا ہے وہ حرفِ آخر ہے۔ اس حوالہ سے وہ رائے عامہ کو ہموار کرتے ہیں اور معاملات کو اچھی طرف لے کر جاتے ہیں۔

انسانی پسند و ناپسند کا تعلق انسانی معیارات و تجربات پر مبنی ہوتا ہے اور اس دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو ذاتی پسند و ناپسند نہ رکھتا ہوں اور ایک اعتبار سے یہ بات بالکل درست ہے کہ ہر انسان اپنے معیارات بناتا ہے اور یہ کافی ذاتی معاملہ بھی ہے جو انسانی شخصیّت و کردار کی ترویج اور ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے لیے قابلِ فہم و ذکاء بناتا ہے۔

ڈاکٹر اطہر محبوب کے قریبی تعلق داروں کی رائے میں وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بہت کم کرتے ہیں اور اس بات پر خاموش رہتے ہیں جو انہیں ناپسند ہو۔ ان کی ناپسندیدہ جگہوں میں سے ایک جگہ امریکہ ہے جہاں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک عشرہ گذارا۔ امریکہ کے سخت قوانین اور مسلمانوں کے خلاف امریکہ کا رویّہ نا پسندیدگی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ امریکہ خود کو دنیا کا چوہدری سمجھتا ہے اور سب پر اپنی دھونس جماتا ہے جس کی وجہ سے امریکہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک کو نا پسند ہے۔ ڈاکٹر اطہر محبوب نے امریکہ کے نظام کو بہت قریب سے دیکھا جہاں طلباء پر بہت پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ وہ کوئی کام نہیں کر سکتے اور فیسوں کا بوجھ انتہائی زیادہ ہے۔ طلباء کے والدین بھاری فیسوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کی رائے میں امریکی پالیسیاں بیشک ناپسندیدہ ہیں مگر امریکہ کے لوگ بہت بہتر ہیں۔ اس سب کے باوجود پاکستان ان کا پسندیدہ ملک ہے۔ موسموں میں ان کا پسندیدہ موسم، موسمِ سرما ہے اور پسندیدہ کھانوں میں گوشت پسند کرتے ہیں جو ذرا نرم ہو اور چٹ پٹا مصالحہ دار بنا ہو۔

انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نفیس شخصیّت کے مالک ہیں اور ان کی نفاست پسندی

کی جھلک ان کے لباس کے انتخاب میں نظر آتی ہے۔ ان کا پسندیدہ لباس سوٹ ہے۔ ان کا پسندیدہ رنگ نیلا ہے اور وہ مخصوص خوشبو استعمال کرتے ہیں جس میں Eternity for Men کی پرفیوم انہیں بہت پسند ہے۔

محنت میں عظمت ہے اور عظیم لوگ ہمیشہ Self Made ہوتے ہیں۔ زندگی میں اپنا مقام بنانے کے لیے ہر انسان کو جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور یہی قانونِ فطرت ہے کہ اپنی منزل کے حصول کے لیے ہر فرد تگ و دو کرے۔ اطہر محبوب کی اپنی عملی زندگی بھی سخت جدوجہد سے عبارت ہے۔ امریکہ میں تعلیم کے حصول کے دوران اپنے تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے یونیورسٹی کے Marriott کیفے ٹیریا میں ملازمت اختیار کی جہاں وہ برتن دھو کر اپنے تعلیمی اخراجات کو پورا کرتے تھے۔اس کیفے ٹیریا میں تین ہزار طلباء کی سروِنگ کی جاتی تھی ۔ اس ملازمت سے انہیں تین ڈالر پینتیس سینٹ فی گھنٹہ ملا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ پارٹ ٹائم ملازمت میں ایک لائبریری میں کام کیا چونکہ امریکہ میں طالبِ علم کو کام کرنے کی اجازت نہیں تھی سوائے رجسٹرڈ کام کے لہٰذا یہ کام سرکاری اجازت کے ساتھ ملا کرتے تھے۔ انہوں نے امریکہ میں جو کل وقتی کام کیا وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مل کر امریکا میں ان کا کاروبار سنبھالا تھا۔ڈاکٹر اطہر امریکہ میں ایک کاروباری شخصیّت کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ انہوں نے ایک سال تک اپنے بھائی کے کاروبار کو کامیابی سے سنبھالا۔ واضح رہے کہ اطہر محبوب کے بڑے بھائی قاضی محمود الحق کا کاروبار امریکہ میں غیر مستحکم ہو گیا تھا جسے سنبھالا دینے کے لیے اطہر محبوب نے انتظام و انصرام اپنے ہاتھوں میں لیا، Clients کی تعداد کو بڑھایا اور اپنی فطری صلاحیتوں سے اس کاروبار کو منافع بخش بنادیا۔ قاضی اطہر محبوب نے کاروبار کی خامیوں کو دور کیا۔ خاص طور پر ٹیکس کے نظام کو باقاعدہ بنایا۔ اگر امریکہ میں ٹیکس بروقت ادا نہ کیا جائے تو ریونیو اتھارٹیز آڈٹ شروع کر دیتی ہیں اور ٹیکس گوشوارے باقاعدگی سے جمع نہ ہونے کی صورت میں کاروبار کو سربمہر کر دیتے ہیں۔

1988ء سے 1996ء تک امریکہ میں اپنے قیام کے دوران اطہر محبوب نے اپنی تعلیم بھی مکمل کی۔ اس کے بعد وہ پاکستان واپس آ گئے۔ پاکستان آکر اپنے لیے ملازمتیں تلاش کیں۔ ان کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ امریکہ میں ہی رہیں اور وہیں قیام کریں مگر اطہر محبوب کو وطن کی محبت نے پاکستان واپس بلایا تھا۔ ان کی پاکستان میں پہلی ملازمت سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی (کراچی) میں تھی جہاں انہیں بہ طور لیکچرر منتخب کیا گیا تھا۔ امریکہ کے علاوہ انہیں سعودی عرب میں بھی ملازمت کے لیے بلایا گیا مگر انھوں نے پاکستان کو ہی ترجیح دی۔ سعودی عرب کے شہر یمبوہ میں ایک نیا ٹیکنیکل کالج بنایا گیا تھا جس میں انہیں پیش کش ہوئی۔ ان دونوں ملازمتوں کے آفر لیٹر انکے پاس تھے مگر انہوں نے سرسیّد یونیورسٹی کو ترجیح دی۔ اس ترجیح کا سبب ان کا تدریس کا شوق تھا اور یوں وہ معلّمی کے شعبہ سے منسلک ہو گئے۔ اس ملازمت کے لیے انہوں نے 1995ء میں اپلائی کیا تھا جب وہ ابھی امریکہ میں ہی تھے۔ انہیں پاکستان میں اس ملازمت کے بابت آگہی وہاں کے ایک پروفیسر سے ملی جنہوں نے اسے انٹرنیٹ پر پاکستانیوں کے ایک فورم پر Post کیا ہوا تھا۔ یہ فورم Use Net پر بنا ہوا تھا اور اس زمانہ میں ابھی گوگل سرچ انجن نہیں بنا تھا۔ اس ضمن میں وہ جب پاکستان آئے تو خود ہی سرسیّد یونیورسٹی گئے اور دریافت کیا کہ میں نے Apply کیا ہوا ہے اور کیا کوئی چانس ہے ملازمت کا، جس پر سرسید یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر، ڈین اور چیئرمین نے ڈاکٹر اطہر کا انٹرویو کیا اور ان کی قابلیّت کو مدّنظر رکھتے ہوئے انہیں Appointment Letter دے دیا گیا۔ یوں انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کی پاکستان میں عملی زندگی کا آغاز ہوگیا۔ سرسیّد یونیورسٹی میں چھ سال 1996ء سے 2001ء تک رہے اور پھر فلوریڈا اسٹیٹ یونیورسٹی امریکہ چلے گئے جہاں وہ 2001ء سے 2006ء تک بہ طور ریسرچ اسسٹنٹ اور ٹیچر اسسٹنٹ کام کرتے رہے۔ اس کے بعد پاکستان دوبارہ آئے اور NUST کراچی کیمپس 2006ء سے 2012ء تک کراچی میں

ملازمت کی۔

ان کی ملازمت پاکستان نیوی انجینئرنگ کالج کراچی میں تھی ۔اس کے بعد وہ 2012ء سے 2015ء تک ڈی ایچ اے صفا یونیورسٹی کراچی میں بطور ڈین اپنے فرائض سر انجام دیتے رہے ۔صفا یونیورسٹی میں ایکٹنگ وائس چانسلر کے طور پر کئی بار کام کیا اور یہیں سے انہوں نے وائس چانسلر شپ کے امور کی انجام دہی سے متعلق کافی آگہی حاصل کی ۔اس کے بعد 2015ء سے 2019ء تک خواجہ فرید یونیورسٹی رحیم یار خان کے وائس چانسلر رہے اور جولائی 2019ء سے تا دمّ تحریر بطور وائس چانسلراسلامیہ یونیورسٹی بہاول پورفرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پوران کے لیے ایک آئیڈیل یونیورسٹی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس یونیورسٹی میں تمام ڈسپلنز میں تعلیم دی جاتی ہے اور اسلامیہ یونیورسٹی فلوریڈا اسٹیٹ یونیورسٹی جیسی ہے جہاں تمام تعلیمی میدانوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔اس لحاظ سے یہ ایک بڑی پبلک یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی میں بڑے بڑے کیمپس ہیں ،لیب کی بہتر سہولت میّسر ہے ۔ امریکہ میں ایسی یونیورٹیوں کو کارنیگی کلاس یونیورسٹیوں کے نام سے جانا جاتا ہے اوراس کی وجہ تسمیہ امریکی مفکر ڈیل کارنیگی ہے جن کا بہت زیادہ کام مینجمنٹ، Intellect اورKnowledge کے حوالہ سے ہے۔ ڈاکٹر اطہر کا فلسفہ فکر یہ ہے کہ تمام مسائل کا حل حصولِ علم میں پوشیدہ ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ سچ کی تلاش بذریعہ علم کی جائے اور یہی تحقیق کا مقصد ہے۔ کارنیگی کلاس یونیورسٹی کی طرح اسلامیہ یونیورسٹی بھی مجموعی طور پر علم کے ہر پہلو کو مدّ نظر رکھتی ہے اور بیک وقت علم کی ترقی وترویج اور تحقیق میں کوشاں رہتی ہے، یوں اسلامیہ یونیورسٹی ایک ایسی یونیورسٹی ہے جہاں تعلیم وتحقیق کے ساتھ ساتھ تعلّم پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی کسی بھی Subject specific یا ٹیکنیکل یونیورسٹی کے وژن سے ہٹ کر ایک بڑی جامعہ ہے جسے دنیا کی اہم جامعات میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ بہ طور وائس چانسلر یہ ان کا وژن ہے کہ

اسے دنیا کی بڑی جامعات کی طرز پر شمار کیا جائے۔ وہ اپنے اس خواب کو مکمل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

اپنے امریکہ میں قیام کے دوران انہیں استاد بننے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ وہاں اساتذہ کو بہت اہمیّت اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ امریکہ میں پروفیسرز کا شمار معاشرہ کے اعلیٰ طبقات میں ہوتا ہے۔ ان کو بہت زیادہ عزت و اہمیت دی جاتی ہے۔ امریکہ میں اکیڈیمیا کو بہت سے حکومتی اعزازات سے بھی نوازا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ فوج بھی اکیڈیمیا سے ہی درخواست کرتی ہے کہ انہیں مختلف مسائل پر تحقیق کر کے دیں۔ معاشرہ میں کسی بھی کسی قسم کا مسئلہ ہوتو وہاں اساتذہ ہی اُس کا حل تجویز کر کے دیتے ہیں۔ امریکہ میں جامعات، معاشرے کا طاقت ور حصّہ ہیں۔ یہی وقار اور عزّت تھی جو انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کے لیے مثالی تھی۔ امریکہ میں بغیر پی ایچ ڈی، استاد کو تدریس کی اجازت نہیں ملتی۔ انھیں اپنے پیشہ الیکٹیریکل انجینئرنگ سے بہت لگاؤ ہے۔ وہ اسی پیشہ کے ساتھ ہر بار اپنی رفاقت رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی اس خواہش اور پسند کی جھلک ان کے بیٹے میں بھی ملتی ہے جنھیں والد محترم نے کافی دوسری تعلیمی جہتیں بتائیں مگر انھوں نے الیکٹریکل انجینئرنگ کے شعبہ کا ہی انتخاب کیا۔

انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب ایک مذہبی خیالات اور اسلام سے دلی لگاؤ رکھنے والے شخص ہیں۔ دین سے یہ لگاؤ انھیں انکے دادا مرحوم سے ملا جو انھیں اپنے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے لے جاتے اور دین کی باتیں سکھاتے تھے۔ گھر میں والد اور والدہ کا رجحان بھی مذہب کی طرف ہے۔ مذہب سے اسی لگاؤ کی وجہ سے جب اطہر محبوب امریکہ گئے تو وہاں کے آزاد معاشرہ اور ماحول نے انہیں اسلام سے مزید قریب کر دیا۔ یہ بزرگوں کا فیضان نظر ہی تھا کہ ایک نوجوان جو سترہ سال کی عمر میں امریکہ جائے اور وہاں کی رنگینیوں میں گم ہونے کے بجائے اسلامی رجحانات کی طرف مائل ہو گیا۔ ان کی والدہ کے مطابق اطہر، بچپن سے ہی نماز اور اسلامی تاریخی واقعات کی طرف

راغب رہا۔ ایک بار جب لڑکپن میں اس کا ہاتھ ٹوٹا، تو ایمبولینس میں کہا کہ یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ میں کبھی کبھی نماز پڑھنے میں غفلت کرتا ہوں۔ وقت پر نماز کی ادائیگی نہیں کر پاتا۔ اب جب میرا ہاتھ ٹھیک ہو جائے گا تو میں بر وقت نماز ادا کیا کروں گا۔

جب اطہر محبوب خود کو امریکی ماحول میں ڈھال نہ سکے۔ امریکہ جا کر انہیں اسلام اور اسلامی شعار کی اہمیّت کا اندازہ پہلے سے زیادہ ہوا اور انہوں نے قرانِ کریم کو سمجھنا شروع کیا۔ وہاں موجود عربی دوستوں سے عربی زبان کی تعلیم حاصل کی تا کہ قرآنِ مجید، فرقانِ حمید کو سمجھ سکیں۔ اپنے اس مذہبی رجحان کو بڑھاتے ہوئے انھوں نے قرآن پاک کی تفسیر اور تراجم کا مطالعہ کیا۔ یوں قرانِ کریم ان کے لیے ایک راہنما اور Source of inspiration بن گیا۔

امریکہ میں رہ کر انہوں نے مختلف اسلامی سکالرز کو پڑھا اور تبلیغی جماعت میں جا کر اسلامی پیغام کو امریکہ کے دور دراز کے علاقوں میں دعوتِ اسلام اور تبلیغِ اسلام کے لیے کام کیا۔ اسکے ساتھ اپنی کمیونٹی میں موجود مساجد کے انتظام و انصرام سے لے کر ان مساجد کی مالی امداد کرتے رہے۔ اپنی کمیونٹی مسجد میں بہ طور وائس پریزیڈنٹ، سیکرٹری اور مسجد کے فنانس کے حوالوں کی بھی دیکھ بھال جیسے اہم مذہبی فریضے ادا کیے۔ فلوریڈا یونیورسٹی میں مسلم کمیونٹی اور مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن میں سرگرم رہے اور وہاں کیمپس میں اپنی یونین کی طرف سے بدھ کے دن اسلامی کتب کا اسٹال لگاتے۔ غیر مسلموں کو دعوتِ اسلام دیتے۔ دینِ اسلام کے متعلق انہیں آگہی فراہم کرتے۔ اس کے علاوہ مذہبی سکالرز و دیگر دینی و تاریخی کتب کے مطالعہ نے ان کے مذہبی رجحانات کو جلا بخشی۔

انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب نے امریکہ میں قیام کے دوران دو ڈگریاں حاصل کیں۔ اب انھوں نے پاکستان آنے کا قصد کیا تو ان کے پروفیسر نے ان کے والد کو بلا کر کہا کہ اطہر پاکستان جانے پر کیوں بضد ہیں۔ والد صاحب نے ان سے کہا کہ یہ اس کا اپنا فیصلہ اور اپنی مرضی ہے۔ اسے اپنے ملک سے لگاؤ ہے۔ یہ اپنے لوگوں میں

واپس جانا چاہتا ہے ۔ اپنے ملک وقوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اپنی مٹّی سے محبت کا جذبہ ان کے خمیر میں ہے ۔ اسی جذبہ نے انھیں واپس پاکستان کی طرف سفر کرنے پر مجبور کیا تھا وگرنہ امریکی یونیورسٹیوں میں پرکشش تنخواہیں اُن کی منتظر رہیں مگر انھوں نے اپنے ملک کو چنا۔ خود کو اپنے لوگوں کے لیے وقف کر دیا۔

زندگی کی اس دوڑ میں ہر شخص مختلف امور کی انجام دہی میں مشغول ہے ۔ اپنی اسی مصروفیت بھری زندگی میں اپنی ذات کو منواتا اور اپنے وجود کو با معانی بناتا ہے مگر بہت ہی کم لوگ اپنے تمام امور کو بطریقِ احسن سرانجام دے پاتے ہیں۔ ان کارہائے مناصب میں پیشہ، خانگی و سماجی معاملات اہمیّت کے حامل ہیں۔ ایک فرد انہی معاملات کے گرد اپنی زندگی کو گذارتا ہے ۔ انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب ایک ماہر انجینئر، بہترین انسان، محبت کرنے والے شوہر اور شفیق باپ ہیں۔ اپنی گوناگوں مصروفیات میں گھرے رہنے والے شخص ہیں مگر کبھی بھی اپنی فیملی سے دور نہیں رہتے ۔ نہ ہی اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہیں۔ یہ ان کی شخصیّت کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے رفقائے کار کے علاوہ سماجی شخصیّت بھی ہیں۔ اپنی کمیونٹی اور دوستوں میں بھی ہر دلعزیز شخص کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے شب و روز کی تقسیم ماہرانہ انداز میں کی ہے ۔ وہ وقت کی تقسیم میں بھی انصاف کے قائل ہیں۔ ان کے اطوار نہایت نپے تلے ہیں۔ ان سے متعلق لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ نظم و ضبط کے کس قدر قائل ہیں۔ ان کی پیشہ وارانہ سرگرمیاں تو عیاں ہیں مگر یہاں احوال ان کی ذاتی زندگی کا پیش ہے جس سے بہت کم لوگ آشنا ہیں۔

انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب اپنے بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر اور بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں۔ اگرچہ عمروں کا یہ فرق زیادہ نہیں ہے۔ اسی لیے اپنے بھائیوں سے ان کا تعلق دوستانہ رہا۔ بچپن میں یہ دوستی مسابقت میں بدلتی رہی جہاں آپس میں تعلیمی مسابقت بہت زیادہ رہی اور تینوں بھائی ایک دوسرے سے آگے نکلنے اور

کلاس میں پوزیشن حاصل کرنے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے تھے۔ یہی مثبت مسابقت تھی جس نے ان تینوں کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے میں معاونت کی مگر جب کبھی بھی کوئی بیرونی عنصر ان سے نبرد آزما ہوا تو تینوں نے اس بیرونی عنصر کے خلاف باہمی اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ بھائیوں کی ایسی بے مثال محبت و یگانگت نے ان تینوں کو جوڑا ہوا ہے۔ آج بھی خاندان میں ان کی دوستی کی مثال دی جاتی ہے۔ بہنیں کیونکہ چھوٹی ہیں اس لیے انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب اور ان کے بھائی انھیں اپنی اولاد کی طرح پیار و اُنس دیتے ہیں۔

شادی کے بعد اطہر محبوب کی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ ان کی مصروفیت بے انتہا بڑھ گئی۔ اس مصروف دور میں ان کی زوجہ نے ان کا بہت ساتھ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس حوالہ سے یہ بات اطہر محبوب پر بالکل صادق آتی ہے۔ 1996ء میں اپنی شادی کے صرف چار دن بعد اپنی یونیورسٹی کے فرائض کو Rejoin کیا۔ اپنی اہلیہ کے لیے کچھ دن نکالنے کی فرصت انہیں دو سال بعد ملی جسے ان کی بیگم ہنی مون نہیں مانتیں۔ ان دو سالوں میں سرسیّد یونیورسٹی میں تدریس و تحقیق میں مگن وہ صبح آٹھ بجے سے رات گئے تک خود کو اس میدان میں منوانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اس دوران ان کی توجہ اپنے گھریلو معاملات کی طرف کم رہی۔ اس اثناء میں ان کی بیگم کا کردار لائقِ تحسین ہے۔ انہوں نے ان کی مصروفیات میں ان کا بہت ساتھ دیا۔ انھوں نے ہمیشہ خود کو حالات کے مطابق ڈھالا، بچوں کا خیال رکھنے سے لیکر اپنے شوہر کی مصروفیات تک تمام امور میں مدد فراہم کی۔ اس بات کا خیال رکھتی رہیں کہ ان کے شوہر جس حد تک اپنے کام کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں وہ ان کا ساتھ دیتی رہیں۔ ان کی موجودگی و غیر موجودگی میں تمام گھریلو امور خود دیکھتی رہیں۔ اس دوران اطہر محبوب اسی کوشش میں لگے رہے کہ وہ کسی طور اپنے کارہائے منصبی میں توازن قائم کر لیں۔ ان کی یہ کوشش کافی حد تک کارگر رہی اور 2014ء سے وہ اس

تبدیلی کو خود پر لاگو کرتے آ رہے ہیں۔ 2013ء سے پیشتر وہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام میں مگن رہتے اور اپنے کام میں ہی اپنی تمام جمع پونجی لگا دیتے۔ اسی دوران میں انھوں نے ایک کمپنی بھی قائم کی جس میں انھیں نقصان اٹھانا پڑا مگر انھوں نے کبھی ہمت نہ ہاری۔ 2014ء کے بعد سے ایک تبدیلی آئی۔ اس تبدیلی کی ایک وجہ ایک پیشہ ورانہ عہد تھا جو نبھایا نہیں گیا۔ یہ وعدہ ان کے ایک وائس چانسلر نے کیا مگر پورا نہیں کیا۔ اس بار بار کی وعدہ خلافی نے اطہر محبوب کو بہت دکھی کیا اس سطح پر آ کر آپ کسی ادارہ کے لیے خلوصِ نیّت سے محنت کریں مگر جب کسی انعام کا وقت آئے تو انتخاب کسی دوسرے کا کر لیا جائے یہ عمل کسی کو بھی دکھی کر سکتا ہے اور اطہر محبوب تو بار بار اس مرحلہ سے گذرے ہیں۔ جس کے بعد وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ کیوں اپنی خانگی زندگی کو خراب کریں۔ دوسری وجہ بڑھتی ہوئی عمر تھی جس میں یہ سوچنا فطری عمل ہے کہ آپ اپنے خاندان کے لیے کیا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ ہفتہ اور اتوار کا دن اپنی فیملی کے ساتھ گذاریں گے برعکس اس کام کے جنون کے جو اس وقت سے پہلے 7/24 کام میں لگے رہنے پر اکساتا تھا۔ اب وہ اپنا زیادہ تر فارغ وقت تنہائی میں گذارنا پسند کرتے ہیں۔ وہ مطالعہ، ٹی وی دیکھنا یا انٹرنیٹ پر جدید ایجادات و اختراعات کے متعلق معلومات سے آگہی حاصل کرتے ہیں۔ اپنے کنبہ کے ساتھ مشغول رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ لمحے بھی کبھی کبھی میسر آتے ہیں وگرنہ اکثر اوقات کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آ ہی جاتی ہے۔ مگر اب وہ کوشش کرتے ہیں کہ ہفتہ، اتوار کو وہ اپنے اور اپنوں کے ساتھ وقت بسر کریں۔

اطہر محبوب اپنے پیشہ سے انتہائی مخلص ہیں۔ وہ Work Alcoholic قسم کے شخص ہیں۔ سرسیّد یونیورسٹی میں چھ سال انہیں خود کو منوانے میں لگے۔ انھیں موقع میسّر آیا وہ سب کرنے کا جو انھوں نے ٹھان رکھا تھا۔ سرسیّد یونیورسٹی نے ہی انکی کامیابیوں کی بنیاد ڈالی۔ وہاں آج بھی اطہر محبوب کے حاصل کئے ہوئے پراجیکٹس اور کامیابیوں کی

بازگشت موجود ہے۔ان کامیابیوں میں ان کا ساتھ سرسیّد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر زیڈ اے نظامی صاحب نے بخوبی دیا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر زیڈ اے نظامی ایک گوہر شناس شخص تھے جن میں انسان پرکھنے اور اس سے کام لینے کی صلاحیت موجود تھی۔ ڈاکٹر زیڈ اے نظامی نے 1996ء سے 2001ء تک انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب کی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے انہیں کھل کر کام کرنے کی آزادی دی ۔ان کی ہر تجویز کی حمایت کی۔جس کے نتیجہ میں ایک کامیاب شخصیّت کی تخلیق ہو پائی۔ ڈاکٹر اطہر محبوب یوں اپنی ترقی کی منازل طے کر کے کراچی سے بہاول پور کی طرف روبہ سفر ہوئے۔

ان کی رائے میں بہاول پور بے مثال لوگوں، تہذیب و تمدن، تاریخی عمارات اور لوک ورثہ سے بھرپور شہر ہے ۔ اس خطہ کے لوگ مہمان نواز اور تہذیب یافتہ ہیں۔ نئے آنے والوں کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں۔ جو بھی اس شہر بے مثال میں آتا ہے وہ یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ اس شہر کا سحر ہے کہ یہاں آنے والے یہاں کے لوگوں کے ایثار و محبت سے متاثر ہو کر یہیں بسیرا کر لیتے ہیں۔ اس شہر کی خوبی، اس کی سادگی اور جدت کا حسین امتزاج ہے ۔ اس شہر میں بڑے شہر کی خوبیاں بھی ہیں اور اس کے ساتھ دیہی ثقافت کی آمیزش بھی ہے۔ روایات بھی ہیں اور تاریخی خوبیاں بھی۔ یہاں آنے والا بیشک کتنا ہی تنہائی پسند کیوں نہ ہو مگر یہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی اور پر خلوص طبیعت، حلقہء احباب میں وسعت پیدا کر ہی دیتی ہے۔ انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب تنہائی پسند اور علیحدگی پسند طبیعت کے مالک ہیں مگر وہ بھی اس شہر کے سحر میں مبتلا ہوئے اور اس شہر کے دل دادہ ہو گئے۔

اطہر محبوب ایک نام ور ماہر تعلیم اور مثالی منتظم کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ تدریس، تحقیق اور صنعتی اداروں میں کام کرنے کا 25 سالہ وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔انھوں نے الیکٹریکل انجینئرنگ میں پی۔ایچ۔ڈی نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی سے کی جب کہ بی۔ایس اور ایم۔ایس کی تعلیم فلوریڈا اسٹیٹ یونیورسٹی امریکہ سے حاصل کی۔ انھوں نے صفا یونیورسٹی ڈیفینس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی میں بطور پروفیسر اور ڈین

خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے پبلک اور پرائیویٹ سیکٹرز کے بہت سے اداروں میں بھی اعلیٰ سطح پر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ڈاکٹر اطہر محبوب ابن خلدون سسٹمز کے بانی ہیں۔ 100 سے زیادہ صنعتی، مالیاتی اور دفاع سے منسلک اداروں میں پروجیکٹس کر چکے ہیں۔ وطن عزیز میں وہ ایک نامور انجینئر، منتظم، ماہر تعلیم اور صنعتی ماہر کے طور پر منفرد مقام رکھتے ہیں۔ حکومت پاکستان نے سائنس و ٹیکنالوجی اور تعلیم کے میدان میں ان کی غیر معمولی خدمات کے اعتراف میں 2012ء میں ڈاکٹر اطہر محبوب کو تمغہ امتیاز سے نوازا۔ دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور کے اساتذہ طلباء اور شہر کے تعلیمی و سماجی حلقوں نے ان کی بطور رئیس جامعہ تقرری کو یونیورسٹی اور علاقے کی تعلیمی ترقی کے لیے انتہائی خوش آئند قرار دیا ہے۔

باب ہفتم

جامعہ اسلامیہ بہاول پور

خوش قسمت ہوتے ہیں وہ شہر جن کی شناخت ان کی درسگاہیں بنیں، مثال کے طور پر مکّہ المکرّمہ دارارقم کی وجہ سے ،قاہرہ اپنی جامعہ الازہر، لندن جامعہ لنکن ان،اور علی گڑھ اپنی جامعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں یہی اعزاز بہاول پور کو حاصل ہے کہ اس شہرِ علم کی پہچان صادق ایجرٹن کالج اور جامعہ اسلامیہ ہیں۔ بہاول پور کو شہرِ علم محاورتاً نہیں کہا جاتا بلکہ ریاست بہاول پور میں اعلیٰ تعلیمی ادارے اس وقت فروغِ تعلیم میں مصروفِ عمل تھے جب برّ صغیر کے بڑے بڑے شہر معیاری درسگاہوں سے خالی تھے۔ بہاول پور میں جامعہ اسلامیہ وہ علمی سرچشمہ ہے جو گذشتہ 96 سال سے علم کی روشنی برّ صغیر میں بکھیر رہا ہے۔ نواب آف بہاول پور سر صادق محمد خان عباسی نے صادق ایجرٹن کالج بہاولپور، صادق عباس کالج ڈیرہ نواب، صادق ڈین ہائی سکول ، صادق گرلز ہائی اسکول کے بعد بھی علم کے فروغ میں تشنگی محسوس کی تو انہوں نے اپنی والدہ محترمہ حضرت مائی صاحبہ کے ایصالِ ثواب دہی کے لئے یہ پہلا مدرسہ مصر کی جامعہ الازہر کی طرز پر اپنی ریاست بہاول پور میں علومِ اسلامیہ کی اعلیٰ تعلیم کیلئے قائم کیا۔ اس پر بھی ان کے ذوق کی تسکین نہیں ہوئی تو 1925ء میں مدرسہ عباسیہ کو دی عربک یونیورسٹی آف بہاول پور عرفِ عام جامعہ عباسیہ کا درجہ دے دیا جو 1964 میں جامعہ اسلامیہ بنا دی گئی اور پھر 1975 میں یہ دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور کے درجہ تک پہنچی۔

آغاز سے ہی اس اس جامعہ کے لئے جید اتالیق مقرر کئے گئے۔ اساتذہ کے لیے اپنے وقت کے بہترین علماء کا انتخاب کیا گیا جن میں شیخ الحدیث مولنا غلام محمد گھوٹویؒ اور شیخ الحدیث، غزالی الزّمان علامہ احمد سعید کاظمیؒ جیسی نابغہ شخصیات شامل ہیں۔ اس جامعہ عباسیہ سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء نے پورے برّصغیر پاک و ہند میں اپنے علم وفن کی دھاک بٹھائی۔ تاریخ کا سفر چلتا رہا جامعہ عباسیہ کا علمی سفر بھی جاری رہا۔ نواب صادق اپنی سنہری یادیں چھوڑ کر اللہ کے حضور پیش ہو گئے لیکن ان کے قائم کئے گئے تعلیمی ادارے چھتنار درخت بنتے گئے جو ان کے لیے صدقہ جاریہ ہیں۔

1975ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں جب محمد حنیف رامے وزیرِ اعلیٰ پنجاب تھے اس وقت پنجاب اسمبلی سے باقاعدہ ایکٹ پاس ہونے کے بعد جامعہ عباسیہ ایک چارٹرڈ یونیورسٹی میں تبدیل ہوگئی اور اس کا نام جامعہ عبّاسیہ سے دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور رکھ دیا گیا جس کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر ابو بکر غزنوی مقرّر کئے گئے۔ جامعہ عباسیہ، بگھی خانے میں واقعہ 126 ایکڑ پر محیط عباسیہ کیمپس پر مشتمل تھی۔ موجودہ عباسیہ کیمپس کی سنگِ سرخ سے بنی ہوئی خوبصورت عمارت 1950ء میں تعمیر کی گئی جو آج بھی اپنی مکمل خوب صورتی اور جلال کے ساتھ موجود ہے۔ گذرتے وقت کے ساتھ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ اب یہ عمارت صرف انتظامی بلاکس پر مشتمل ہے تدریسی شعبہ جات یہاں سے بغداد الجدید کیمپس حاصل پور روڈ منتقل کر دیئے گئے ہیں جو شہر بہاول پور سے سات کلومیٹر دور ہے۔ اس وقت عباسیہ کیمپس میں وائس چانسلر کا دفتر، خوبصورت گیسٹ ہاؤس، بینک، رجسٹرار اور اسسٹنٹ رجسٹرارز کے دفاتر، ٹریژرر آفس، شعبہ ٹرانسپورٹ، گرلز و بوائز ہاسٹل، آن لائن داخلوں کا ڈائریکٹوریٹ، ڈائریکٹوریٹ آف پبلک ریلشنز، شعبہ امتحانات، شعبہ قانون اور ڈائریکٹوریٹ آف کمیونٹی براڈ کاسٹ ریڈیو، ٹی وی اور فلم اس کیمپس میں اپنے سرکاری فرائض کی انجام دہی کر رہے ہیں۔

1975ء میں جب جامعہ عباسیہ ایک چارٹرڈ یونیورسٹی میں تبدیل ہوئی تو اس

وقت تک شہر کی آبادی میں کافی حد تک اضافہ ہو چکا تھا۔ جامعیہ عباسیہ کے دور میں محدود شعبہ جات تھے تو کیمپس نا کافی ثابت ہو رہا تھا لیکن چارٹرڈ یونیورسٹی بننے کے بعد یہاں علومِ اسلامیہ کے علاوہ سائنس اور آرٹس کے شعبے بھی قائم کئے گئے جن کی وجہ سے عباسیہ کیمپس کی وسیع عمارت چھوٹی پڑ گئی۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے ریلوے روڈ پر ایک نئی عمارت حاصل کی گئی جس میں سائنس کے شعبوں کا اجراء کیا گیا اور اس عمارت کو خواجہ فرید ریلوے روڈ کیمپس کے نام سے موسوم کیا گیا۔ تمام شعبوں کے بغداد کیمپس میں منتقل ہو جانے کے باوجود خواجہ فرید (ریلوے روڈ) کیمپس خالی نہیں کیا گیا اور آج یہ عمارت کالج آف فارمیسی کہلاتی ہے۔ ریلوے روڈ کیمپس میں جہاں فزکس، کیمسٹری، جغرافیہ، اُردو، انگریزی، لائبریری سائنس، ایجوکیشن، ایجوکیشنل ٹریننگ کے شعبے قائم تھے وہیں اس کی بالائی منزل پر بوائز ہاسٹل بھی تھا۔

جامعہ اسلامیہ نے بہت تیزی سے ترقی کی اور ہر سال طلباء کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا گیا اور جلد ہی جامعہ اسلامیہ پاکستان کی چند نمایاں جامعات میں شمار کی جانے لگی۔ جامعہ اسلامیہ کو اس وقت علمی طور پر بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی جب 1984ء میں اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالقیوم قریشی نے عالمی شہرت یافتہ اسلامی علوم کے ماہر، محقق اور فلسفی ڈاکٹر حمید اللہ کو جامعہ اسلامیہ میں آنے اور لیکچر دینے کیلئے آمادہ کر لیا۔ مارچ 1984ء میں ڈاکٹر حمید اللہ جامعہ اسلامیہ کی دعوت پر تشریف لائے اور پندرہ دن تک روزانہ بعد نماز عصر سے مغرب تک اپنے وہ مشہورِ عالم خطبات دیئے جو آج خطباتِ بہاول پور کے نام سے مشہور ہیں۔

میرِ کارواں، دانائے رموز؛ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلرز کا اجمالی تعارف

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر ابوبکر غزنوی

19 فروری 1975 کو مغربی پاکستان کی پنجاب اسمبلی نے جن پانچ بلوں کی منظوری دی ان میں سے دو بل جنوبی پنجاب میں دو پبلک سیکٹر یونیورسٹیوں کی منظوری کے تھے جس میں ایک ملتان میں اور دوسری یونیورسٹی بہاولپور میں قائم کی گئی۔ اس بل کی پیروی کرتے ہوئے صوبائی وزیر تعلیم ڈاکٹر عبد الخالق نے جامعہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ جامعہ دین کی تعلیم کے ساتھ سائنس و آرٹس کی اعلیٰ تعلیم کو بھی ترویج دے گی۔ 4 مارچ 1975ء اس بل کی منظوری کے بعد یونیورسٹی کے ایکٹ کی تیاری ہوئی اور اسی دن منظوری کے مراحل سے گذر کر جامعہ اسلامیہ تدریجی منازل طے کر کے موجودہ جامعہ اسلامیہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ چوں کہ جامعہ اسلامیہ اپنی تشکیل کے اعتبار سے کئی سال پہلے معرض وجود میں آ چکی تھی اس وجہ سے اس جامعہ کو ملتان کی جامعہ پر فوقیت حاصل رہی۔ اول اس بناء پر کہ اس جامعہ کے پاس وسیع رقبہ، بہترین انفرا اسٹرکچر تو تھا ہی تاہم ماہر اساتذہ کرام کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ جامعہ کے پہلے وائس چانسلر کا تقرر قدرے تاخیر سے ہوا۔ ابتدا میں یوں ہوا کہ جو انتظام و انصرام محکمہ اوقاف کے پاس تھا اسے صوبائی وزارت تعلیم کے سپرد کیا گیا اور اس کا چارج پروفیسر محمد ساجد، ڈائریکٹر تعلیمات

بہاول پور کے ہاتھ رہا۔ ان کے تبادلہ کے بعد اس کا چارج صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کے پرنسپل پروفیسر منور علی خان کو دے دیا گیا۔ یونیورسٹی کے ایکٹ کے منظوری کی چھے ماہ بعد جامعہ اسلامیہ کے پہلے وائس چانسلر کا تقرر عمل میں آیا۔ یہ قرعہ یونیورسٹی آف انجنیئر نگ لاہور کے پروفیسر مولانا ابوبکر غزنوی کے نام نکلا اور یوں یہ اعزاز ایک فاضل عالم کو ملا۔ پروفیسر مولانا ابوبکر غزنوی مشہور عالم دین مولانا داؤد غزنوی کے فرزند تھے۔ ان کے خاندان نے بر صغیر میں طویل مدت تک دینی مدارس اور دینی خدمات انجام دیں۔ پروفیسر مولانا ابوبکر غزنوی اسلامیہ کالج سول لائنز میں شعبہ عربی کے سربراہ کی حیثیت سے بھی فرائض سر انجام دیتے رہے اور کچھ عرصہ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور سے منسلک رہے۔ پروفیسر مولانا ابوبکر غزنوی نے چارج سنبھالتے ہی اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اسے ایک مکمل اسلامی یونیورسٹی بنائیں۔ پروفیسر مولانا ابوبکر غزنوی نے 1950ء میں ایم اے عربی پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ 1955 میں انہوں نے قانون کا امتحان پاس کیا اور اسلامیہ کالج لاہور کے شعبہ تدریس و تحقیق سے منسلک ہوگئے اس تمام عرصہ میں انہوں نے تین تمغے حاصل کئے اور 1964 میں وہ انجنیئر نگ یونیورسٹی لاہور میں چیئر مین شعبہ اسلامیات تعینات ہوئے۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے مصنف تھے اور پندرہ سے زائد اُردو اور انگریزی کتابوں کی تصنیف نگاری کر چکے تھے۔ پروفیسر مولانا ابوبکر غزنوی کی صورت میں جامعہ اسلامیہ کو ایک عالم میسر آیا جو کہ اسلام، عربی زبان و ادب اور فقہ میں یکتائے روزگار تھا۔ پروفیسر مولانا ابوبکر غزنوی کو اردو اور فارسی کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ ان کے خاندان کا قریبی تعلق علامہ محمد اقبال سے رہا۔ ان کے دور میں طلبا یونین تشکیل پائی جس کی باقاعدہ حلف تقریب برداری 2 مارچ 1976 کو ہوئی۔ پروفیسر ابوبکر غزنوی کی زندگی نے وفا نہیں کی اور اپریل میں ایک سرکاری دورۂ برطانیہ کے دوران ایک ٹریفک حادثہ کے دوران وہ انتقال کر گئے۔ وہ وہاں جشن اسلام کے سلسلہ کی تقریبات میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ پروفیسر مولانا ابوبکر غزنوی ایک بلند پایہ عالم، اسلامی مدبر اور دانشور تھے ان کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا کو کبھی پر نہیں کیا جا سکتا۔ یوں جامعہ اسلامیہ آٹھ ماہ کے قلیل عرصہ میں اپنے سربراہ سے محروم ہوگئی۔

پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

۲۔ مولانا ابوبکر غزنوی کی وفات کے بعد یونیورسٹی شدید بحرانی کیفیت سے دو چار رہی۔ یونیورسٹی کا تمام انتظام و انصرام تلپٹ ہو گیا امتحانات ملتوی ہو گئے اور کئی طلبا کا مستقبل داؤ پر لگ گیا۔ صورتحال طلبا کے بھوک ہڑتال تک آن پہنچی اور حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے آخر کار جولائی 1976 میں ملک کے نامور سکالر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کو وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ تعینات کیا گیا۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر دائرہ معارف الاسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے معتمد تھے۔ ان کے درجنوں مقالے اور پینتیس کتب شائع ہو چکی تھیں جن کا موضوع قرآن اور سیرت النبی تھا۔ ان کی خدمات کے صلہ میں تنظیم رابطہ عالمِ اسلامی نے انھیں خطیر انعامات سے نوازا۔ پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کا کام حسن تفسیر کے نام سے موسوم ہے اور اس حوالے سے ان کی تفسیر کی تین جلدیں شائع ہوئیں ۔ وہ اس کام کو مکمل نہ کر پائے اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مذکورہ بالا ان دونوں رئیس الجامعہ کا تعلق امرتسر تھا اور دونوں ہی جیّد علمائے کرام تھے اور ایک قدرِ مشترک یہ بھی تھی کہ ان دونوں صاحبان میں عشقِ مصطفےٰ ﷺ موجزن تھا۔ انہوں نے بھی اس عزم کا اعادہ کیا اور اس کے لئے برسرِ پیکار رہے کہ جامعہ اسلامیہ کو ایک مثالی دانش گاہ بنائیں گے۔ ان کے دور میں سائنس (کیمیا، فزکس اور شماریات) اور ہیومینٹی (شعبہ جات اُردو، انگریزی، معاشیات اور سیاسیات) کے دو نئے کلیّات کا آغاز ہوا۔ ان کی علم دوستی کا ثبوت ۱۳۹۶ھ میں بین الاقوامی تنظیم رابطہ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ کے زیر اہتمام پہلی سیرت نبوی ﷺ کانفرنس کا پاکستان میں انعقاد بھی تھا۔ اِس کانفرنس کے اختتام پر منتظمین نے اعلان کیا کہ سیرتؐ پر کتاب لکھوانے کا ایک مقابلہ کرایا جائے گا۔ اِس مقابلے میں سیرت نگاری کے 171 مقالے موصول ہوئے جن میں 84 مقالے عربی زبان میں تھے۔ 64 اُردو میں، 21 انگریزی میں، ایک فرانسیسی اور ایک ہوسا زُبان میں تھا۔ سیرت پاکؐ کے موضوع پر اِس بین الاقوامی مقابلے میں اُن کی کتاب تیسرا انعام جیتنے میں کامیاب ہو ئی۔ یہ کامیابی

پاکستان کے ساتھ ساتھ جامعہ کے لیے بھی ایک اعزاز تھا۔ اُنہیں تیس ہزار سعودی ریال کا انعام بھی ملا تھا۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے اسلامیہ یونیورسٹی میں پہلی بار ہر طالبِ علم کو وظائف سے نوازا ۔ابھی تک اسلامیہ یونیورسٹی میں پنجاب یونیورسٹی کے بنائے ہوئے نصاب کے تحت تعلیم دی جا رہی تھی ۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کے دَور میں ہی اسلامیہ یونیورسٹی نے اپنے مضامین کے نصاب خود مرتب کیے اَور اسلامیات کا مضمون ہر شعبہ میں لازمی مضمون کے طور پر شامل کیا گیا تا کہ جامعہ کا اسلامی تشخص قائم رکھا جا سکے ۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے جب وائس چانسلر کے عہدہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اُس وقت جامعہ میں صرف پندرہ اساتذہ تھے ۔ اُنہوں نے پہلی مرتبہ اساتذہ کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے 36 نئے اساتذہ بھرتی کیے اَور یوں اساتذہ کی مجموعی تعداد 51 ہوگئی۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے نئی جامعہ کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے میں بہت اہم کردار کیا ۔ یکم دسمبر 1977 کو جامعہ اسلامیہ کی پہلی بس خریدی گئی جس سے طالبِ علموں کو سفری دشواری میں آسانی ہوئی ۔اسی دور میں اساتذہ اور وائس چانسلر کو علی الترتیب 17واں اور 22واں سکیل دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی ہاؤس رینٹ کا آغاز ہوا۔ان کا شاندار دور 19 نومبر 1978 کو اختتام پذیر ہوا۔

۳۔ پروفیسر عبدالقیوم قریشی

پروفیسر ڈاکٹر عبدالقیوم قریشی پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی برطرفی کے بعد اس جامعہ کے تیسرے وائس چانسلر کے طور پر 20 نومبر 1978 کو منتخب ہوئے۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالقیوم قریشی اس سے قبل سیکرٹری تعلیمات اور ثانوی بورڈ لاہور کے چیئرمین کے بہ طور اپنے فرایض سر انجام دے چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب پیشہ کے اعتبار سے ایک میڈیکل ڈاکٹر تھے جو وسیع انتظامی قابلیت اور تجربہ رکھتے تھے۔ جامعہ اسلامیہ کے تیسرے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر عبدالقیوم قریشی کا تعلق لاہور سے تھا جہاں انہوں نے 1945 میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا اور 1947 میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی فزکس کی ڈگری حاصل کی۔ آپ بہت متحرک شخصیت اَور بہترین منتظم ہونے کے ساتھ دُور اندیش بھی تھے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم قریشی نے طلباوطالبات کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھتے ہوئے محسوس کر لیا تھا کہ عباسیہ کیمپس جلد ہی چھوٹا پڑ جائے گا، اس کے پیش نظر انھوں نے جامعہ اسلامیہ کے لیے نئی عمارت کی کوشش شروع کر دی۔ اُن کی تحریک پر ہی پنجاب حکومت نے بغدادالجدید ریلوے سٹیشن سے کچھ آگے 1005 ایکڑ (40 مربعے) اراضی الاٹ کر دی جس پر آج شان دار نیو کیمپس بغداد الجدید آباد ہے۔ اراضی کا حصول ڈاکٹر عبدالقیوم قریشی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اُنھی کے دَور میں بغداد کیمپس کی بہترین منصوبہ بندی کے ساتھ تعمیر شروع ہو گئی تھی۔ یہ ان کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتیں کہ انھوں نے دو سال چار ماہ اور سترہ دن میں وہ کارنامے سر انجام دیئے جن کی انجام دہی میں شاید عشرے بھی کم پڑیں۔ ڈاکٹر عبدالقیوم قریشی نے بھی بہترین اساتذہ کو جامعہ اسلامیہ میں اکٹھا کیا۔ اُن کے دور میں اساتذہ کی تعداد 51 سے بڑھ کر 86 ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر عبدالقیوم قریشی نے ہی اپنے نوجوان اساتذہ کو پہلی مرتبہ پی ایچ ڈی کے لیے بیرونِ ملک بھیجا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم قریشی کے دور میں اکیڈیمک سرگرمیاں عروج پر تھیں اور وہ بھی اپنے predecessors کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے جامعہ اسلامیہ کو ایک شاندار مقام دلوانے کے لئے تگ و دو کرتے رہے۔ ان کے دور میں اکیڈیمک کونسلز

اور بورڈ آف سٹڈیز کو مروج کیا گیا جس میں یونیورسٹی کے علماء کے ساتھ باہر سے بھی علماء کو شامل کیا گیا جن میں خاص طور پر صادق ایجرٹن کالج اور صادق ڈگری گرلز کالج سے اساتذہ کو شامل کر کے ایک عمدہ نصاب کی ترویج عمل پذیر ہوئی اس کی بنیادی وجہ یونیورسٹی میں اساتذہ کی قلت رہی جسے بعد میں آنے والے رئیس الجامعہ نے پورا کیا۔ بورڈ آف سٹڈیز میں اس دور میں شعبہ کے چیئر پرسن سمیت چار اساتذہ اور دیگر تین افراد کو باہر سے بطور ممبر شامل کیا جاتا تھا جو اپنے مضمون کا ماہر ہوتا تھا اور کم و بیش آج بھی یہی سلسلہ جاری و ساری ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالقیوم قریشی کے زمانہ میں یونیورسٹی میں دو نئے شعبہ جات ریاضی اور قانون کا شعبہ متعارف کرائے گئے جن کا آغاز ریلوے روڈ کیمپس میں ہوا جہاں اولین پروفیسر محمد علی مقرر ہوئے جو اسی مادرِ علمی سے فارغ التحصیل تھے۔ ان شعبہ جات کے ساتھ چولستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیزرٹ سٹڈیز کی بھی داغ بیل ڈالی گئی جو اس روہی کی ترقی کے لیے قائم کیا گیا۔ انہی کے دور میں یونیورسٹی میں امتحانات کے شیڈول میں ایک باقاعدگی اور تسلسل نظر آیا اور سندھ اور کشمیر تک سے طلبا ان کی کاوشوں سے اس جامعہ میں کھینچے چلے آئے۔ انھوں نے نہ صرف اکیڈیمیا پر توجہ دی بلکہ یونیورسٹی کے توسیعی منصوبوں پر دلجمعی سے کام کرتے ہوئے اس جامعہ کو جدید جامعات کے مد مقابل لا کھڑا کیا جس میں اکیڈیمک کونسل کا قیام اور سنڈیکیٹ کی تشکیل انتہائی اہم ہے جس نے یونیورسٹی کو باقی جامعات کے مدِ مقابل لا کھڑا کیا۔ ایک ایسا کارنامہ جو پروفیسر ڈاکٹر عبدالقیوم قریشی نے کیا وہ نہ صرف ان کے لئے بلکہ اس جامعہ اسلامیہ کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کے لئے بھی عظمت و رفعت کا باعث ہے اور رہتی دنیا تک رہے گا وہ کارنامہ خطباتِ بہاول پور کا ہے جس کا انتظام و انصرام اللہ سبحان و تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں سے کروایا۔ وہ اس یونیورسٹی سے اس وقت باہر کر دیئے گئے جب وہ لاہور میں تھے اور ان کی وائس چانسلر شب کی اختتام کی وجہ وہ قطعہ اراضی تھا جسے بینڈ ماسٹر ہاوس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ زمین کا ٹکڑا یونیورسٹی کو مل جائے مگر اربابِ اختیار نے انہیں منصب سے ہی ہٹا دیا۔ ان کے بعد جامعہ کے چوتھے وائس چانسلر ڈاکٹر رفیق احمد بنے۔

۴۔ پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد

11 اپریل 1981ء کی صبح نے جامعہ اسلامیہ میں ایک نئی فکر انگیز شخصیّت پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد کو متعارف کروایا۔ پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد سابقہ وائس چانسلر یونیورسٹی آف پنجاب ایک مشہور ماہرِ معاشیات تھے جو گذشتہ 35 سالوں سے تحقیق و تدریس کے شعبہ سے منسلک تھے۔ ان کی خدمات نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرونِ ملک میں بھی ستائشی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی۔ انھوں نے اپنی ڈی فِل کی ڈگری آکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ سے حاصل کی تھی۔ پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد کی سات تصانیف تھیں جس میں انھوں نے معیشتِ پاکستان اور اسلامی معاشیات کے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی۔ پچاس سے زائد قومی و بین الاقوامی رسائل و تحقیقی جرائد میں انکی تحقیق شائع شدہ تھی۔ انامک انسائٹ کے چیف ایڈیٹر اور نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے وائس چیئر مین تھے۔ الغرض اسلامیہ یونیورسٹی کو ان کی صورت میں پہلی مرتبہ ایک ایسی شخصیّت ملی جو یونیورسٹی تعلیم، تحقیق و تدریس اور معاملات سے مکمل آگہی رکھتی تھی۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد کے دور میں بھی جامعہ اسلامیہ کی ترقی کا سفر جاری رہا۔ بغداد کیمپس میں طالبات کے لیے پہلے باقاعدہ ہاسٹل کی تعمیر انہی کے زمانے میں ہوئی۔ طلبا یونین کا آغاز بھی ڈاکٹر رفیق احمد کے دَور میں ہوا۔ انہوں نے ڈپلومہ لائبریری سائنس شروع کیا اور جلد ہی اسے ایم اے کا درجہ دے دیا۔ ڈاکٹر رفیق احمد چولستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیزرٹ سٹڈیز کو مزید ترقی دی۔ طالبات کے ہاسٹل کے بعد بغداد کیمپس میں سائنس فیکلٹی، آرٹس فیکلٹی، اسلامک لرننگ فیکلٹی اور مرکزی لائبریری کی عمارات تعمیر کروائیں۔ کثیر سرمائے سے لائبریری کے لیے کتابیں منگوائی گئیں۔ گرین بیلٹ بھی ڈاکٹر رفیق احمد کا ہی تحفہ ہے۔ بغداد کیمپس میں پہلی شجر کاری مہم بھی ڈاکٹر رفیق احمد نے شروع کی تھی۔ اساتذہ کے لیے بہترین مکانات پر مشتمل کالونی بھی اُسی دور میں تعمیر ہوئی۔ ڈاکٹر رفیق احمد ایک وسیع المطالعہ استاد تھے۔ کتاب کی اہمیت سے واقف تھے۔ انھوں نے اساتذہ

اور طلبا کی تخلیقی صلاحیتوں کو جِلا بخشنے کے لیے سائنس فیکلٹی سے مجلّہ " پیور اینڈ اپلائیڈ سائنسز"، اسلامی فیکلٹی سے مجلّہ "بصائر" اور ماہنامہ " اطلاعات " جبکہ طلبا کیلئے سالانہ مجلّہ " سروش" شروع کیا۔ڈاکٹر رفیق احمد نے گھوٹوی ہال میں " پاکستان گیلری " بھی قائم کی ۔27 اساتذہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیجا اور اُن کی مالی معاونت کے لیے وظائف جاری کیے۔ تعلیم مکمل کر کے آنے والے اساتذہ کو ترقیاں دیں۔ ملک بھر سے بہترین اساتذہ کو ڈھونڈ کر جامعہ اسلامیہ میں تعینات کیا۔ان کے دور میں سب سے اہم کارنامہ عالمی سائنسی کانفرنس کا انعقاد تھا جس کے حوالے سے اسلامیہ یونیورسٹی کو پہلی بار مذہبی و دینیاتی یونیورسٹی کے علاوہ سائنس کے حوالے سے بھی شناخت ملی۔ پروفیسرڈاکٹر رفیق احمد کے دور سے قبل جامعہ اسلامیہ کا کوئی گیسٹ ہاؤس نہیں تھا جس کی وجہ سے مہمانان کو اساتذہ کے گھروں میں مقیم کیا جاتا اس تکلیف کو دیکھتے ہوئے پہلی مرتبہ اولڈ کیمپس میں چار کمروں، ایک ڈرائنگ روم اور کچن پر مشتمل ایک مہمان خانہ تعمیر ہوا جو آج بھی گیسٹ ہاؤس کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے ساتھ بغداد الجدید کیمپس میں سب سے بڑا کام تین کلیّات کی تعمیر کا کام تھا جس میں سائنس، آرٹس اور اسلامک لرننگ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ 1982 میں ہی سروش نام سے ایک علمی و ادبی مجلّہ شائع ہوا جو اپنی مثال آپ تھا۔ دیگر قابلِ ذکر کارناموں میں شعبہ لائبریری سائنس کے ڈپلوما کا آغاز نیز شعبہ تاریخ کے زیرِ اہتمام پاکستان گیلری کا قیام اور شعبہ اردو و اقبالیات میں تحقیق و ترجمہ کے سیل کا قیام اور شعبہ قانون میں شبینہ کلاسز کا اجرا شامل ہیں۔ پروفیسرڈاکٹر رفیق احمد ایک مصروف شخصیّت تھے اور وہ اپنی مصروفیات کے باعث جامعہ اسلامیہ کو اتنا وقت نہ دے پائے اور جلد ہی وہ ترقی پا کر پنجاب یونیورسٹی روانہ ہو گئے۔

۵۔ پروفیسر ڈاکٹر ذوالفقار ملک

19 جنوری 1985 کو یونیورسٹی کی باگ ڈور ڈاکٹر ذوالفقار ملک نے بہ طور پانچویں وائس چانسلر کے سنبھالی۔ پروفیسر ڈاکٹر ذوالفقار ملک بھی دیگر وائس چانسلرز کی طرح خاص الخاص لاہوری تھے اور ان کا تعلق شرق پور سے تھا۔ جامعہ اسلامیہ آمد سے قبل ڈاکٹر ذوالفقار ملک پنجاب یونیورسٹی کے صدر شعبہ عربی، ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ اور پرنسپل اورینٹل کالج کے مناصب پر براجمان رہ چکے تھے۔ ڈاکٹر ذوالفقار ملک دو دفعہ پی ایچ ڈی کر چکے تھے ایک ڈگری پاکستان سے کی اور دوسری ڈگری برطانیہ سے کر کے آئے تھے۔

ڈاکٹر ذوالفقار ملک نے بھی اپنے پیش رو وائس چانسلرز کی طرح جامعہ اسلامیہ کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اُن کے دَور میں شعبہ جغرافیہ کو سب سے پہلے بغداد کیمپس میں منتقل کیا گیا۔ یوں شعبہ جغرافیہ کو بغداد کیمپس میں تدریسی سرگرمیاں شروع کرنے کا منفرد اعزاز حاصل ہوا۔ اُس وقت ڈاکٹر محمد خان ملک شعبہ جغرافیہ کے چیئرمین تھے۔ ڈاکٹر ذوالفقار ملک نے نئے مضامین شروع کیے جن میں فارسی، جغرافیہ، صحافت اور ایجوکیشن شامل ہیں۔ اُن کے دور میں تعلیمی شعبوں کی تعداد 18 تک پہنچ گئی۔ شعبہ جغرافیہ کے طلبا و طالبات نے بغداد کیمپس کے ابتدائی دور میں خوب شجر کاری کی۔ بغداد کیمپس میں داخل ہوتے ہی دائیں بائیں جو درخت نظر آتے ہیں یہ اُسی زمانے کی یادگار ہیں۔ ڈاکٹر ذوالفقار ملک نے جاری ترقیاتی منصوبوں کو مکمل کروایا گیا اور نئے منصوبے بھی شروع کیے گئے۔ ڈاکٹر ذوالفقار ملک نے ہی اسلامیہ یونیورسٹی میں 75 ایکڑ پر محیط پہلا زرعی فارم قائم کیا جس میں بانس، کینو اور آم کے پودے کاشت کیے گئے۔ ان کے دیگر قابلِ ذکر امور میں بغداد الجدید کیمپس کو بسانے کا کام اور یہاں اساتذہ کی رہائش و مسجد کے قیام کے ساتھ ساتھ 1988 میں شعبہ فارسی اور شعبہ تعلیم کا قیام شامل ہیں۔ ایک سب سے اہم فریضہ جو اُن کے دور میں ہوا وہ 1986 میں سیرت چیئر کا تھا جس کے زیرِ

اہتمام اب تک دس عالمی سیرت چیئر کانفرنسوں کے علاوہ درجنوں سیمینار منعقد ہو چکے ہیں جو اس جامعہ کی اساس اور روح کے متقاضی ہے۔ انہی کے دور میں جامعہ کا پہلا پی ایچ ڈی شعبہ شماریات میں ڈاکٹر محمود احمد کی صورت میں 1988 میں شائع ہوا اور انہیں ڈگری عطا کی گئی۔ ڈاکٹر ذوالفقار ملک کا تعلق ایک کاشت کار گھرانے سے تھا اور وہ خود بھی ایک زمیندار تھے اس لئے انھوں نے اپنے دور میں بانس، کنوں اور آم کے باغات لگائے جس سے نہ صرف یہ ریتلا میدان سرسبز ہوا بلکہ اس سے یونیورسٹی کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اسلامیہ یونیورسٹی میں ان کے دور میں اتنی شجر کاری ہوئی کہ اسلامیہ یونیورسٹی کو صدارتی ایوارڈ ملا۔ ڈاکٹر ذوالفقار ملک کو جامعہ کے پہلے ایسے وائس چانسلر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا جنہوں نے اپنا دورِ وائس چانسلرشپ مکمل کیا۔ وہ چار سال تک وائس چانسلر رہے۔

۶۔ پروفیسر ڈاکٹر مصباح العین خان

ڈاکٹر مصباح العین خان پہلے بہاول پوری مقامی پروفیسر تھے جو وائس چانسلر بنے۔ 1984 میں ڈاکٹر مصباح العین خان بہ طور پروفیسر تعینات ہوئے اور آتے ہی چیئر مین اور ڈین مقرر ہوئے اور پھر بیک وقت دو کلیّات کے ڈین بنے یعنی فیکلٹی آف آرٹس اور سائنس۔ 16 اپریل 1989 کو ان کے عہد کا آغاز ہوا جو چار سال اور دو ماہ تک محیط رہا۔ ۲ ماہ انہیں عبوری عہدہ ملا۔

1989ء میں پہلی مرتبہ شعبہ کیمیا، جامعہ اسلامیہ کے ہی مایہ ناز استاد ڈاکٹر مصباح العین خان کو وائس چانسلر بنایا گیا۔ ڈاکٹر مصباح العین خان ایک سلیم الطبع انسان ہیں۔ آج کل بھی جامعہ اسلامیہ کے پروفیسر آف ایمریطس ہیں۔ اِنھوں نے بھی نئے تعلیمی شعبوں کے قیام میں بہت دلچسپی لی۔ آپ نے شعبہ صحافت کو ڈپلومہ سے ماسٹر ڈگری کا درجہ دیا۔ فارمیسی اور بی ایڈ کے نئے شعبے قائم کیے۔ ڈاکٹر مصباح العین خان کے دَور میں ہی جامعہ اسلامیہ کو تیسری مرتبہ قومی سائنس کانفرنس کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ پروفیسر ڈاکٹر مصباح العین خان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کا نام اسلامیہ یونیورسٹی کی طرف سے مطبوعہ اہلِ قلم ڈائریکٹری بہاول پور میں شامل ہے۔ ڈاکٹر مصباح العین خان کی تاریخ پیدائش 22 ستمبر 1935 ہے۔ انہوں نے یونیورسٹی آف کراچی سے اپنی ماسٹرز کی ڈگری مکمل کی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری یونیورسٹی آف تسمانیہ آسٹریلیا سے کی۔ پوسٹ ڈاکٹریٹ کی تعلیم کینیڈا اور یو کے سے کی اور اس کے بعد وہ برازیل میں بہ طور ایسوسی ایٹ پروفیسر ذمّہ داریاں نبھاتے رہے۔ ان کے 280 سے زائد مقالہ جات شائع شدہ ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ حوالہ انکی علمی شخصیّت کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کے دور میں ان کے مخالفین بہت زیادہ تھے مگر انہوں نے ہر ممکن اپنے مزاج اور معاملہ فہمی سے یونیورسٹی کی ترویج و ترقی کے لئے کام کیا اور ان کے دور میں شعبہ کرائیکی اور شعبہ فارمیسی کی داغ بیل ڈالی۔

ڈاکٹر مصباح العین خان ایک ترقی پسند شخصیّت کے حامل ہیں اور انہوں نے مقدور کوشش کی کہ جامعہ کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کریں اس سلسلہ میں انہوں نے ریلوے روڈ کیمپس میں ایک کمپیوٹر سیل قائم کیا جو بعد میں شعبہ کمپیوٹر سائنس بنا۔ انھوں نے بغداد الجدید کیمپس میں کئی نئی اور نامکمل تعمیرات کو تکمیل کے مراحل تک پہنچایا جس میں کینٹین اور یونیورسٹی سکول کی عمارت کی تعمیر قابلِ ذکر ہے۔1993 میں عین قیاس تھا کہ ڈاکٹر مصباح العین خان کو دوسری مدّت کے لئے وائس چانسلرشپ مل جائے گی مگر انہی دنوں میاں منظور موہل ایم پی اے اسلامیہ یونیورسٹی کے ممبر سینڈیکیٹ بن گئے جو اتفاق سے پروفیسر ڈاکٹر بلال سکھیرا کے حامی تھے انہی دنوں ایوانِ سیاست میں ہل چل کے باعث میاں منظور وٹو کو منظور موہل کی مدد کی ضرورت پڑی اور یوں 15 جون 1993ء کو پروفیسر ڈاکٹر بلال سکھیرا اسلامیہ یونیورسٹی کے ساتویں وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

۷۔ پروفیسر ڈاکٹر بلال سکھیرا

1993ء میں شعبہ فزکس کے ڈاکٹر بلال سکھیرا کو وائس چانسلر لگایا گیا۔ آپ بھی جامعہ اسلامیہ کے استاد تھے ۔ آپ نے بھی کمپیوٹر سائنس اور ایم بی اے کے نئے شعبے کھولے اور چولستان انسٹی ٹیوٹ کو سینٹر آف ایکسی لینس کا درجہ دیا۔ یونیورسٹی میں پہلی دفعہ ٹیلی فون ایکسچینج قائم ہوئی ۔ مقامی طلبا کیلئے یونیورسٹی کی 50 فیصد نشستیں مختص کی گئیں۔ پروفیسر ڈاکٹر بلال سکھیرا کا تعلق ہوشیار پور سے تھا اور وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ پروفیسر ڈاکٹر بلال سکھیر کے دور میں اساتذہ کے لئے ایک کوسٹر اور لا تعداد بسیں خریدی گئیں کیونکہ یونیورسٹی طلباء اور اساتذہ کی تعداد بڑھ گئی تھی اور بغداد الجدید کیمپس آباد ہو رہا تھا جو شہر سے سات کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا۔ انہی کے دور میں بغداد الجدید میں وائس چانسلر ہاؤس تعمیر ہوااس کے ساتھ ان کے کارناموں میں خاص طور پر بغداد الجدید کی مرکزی مسجد کا قیام ہے۔ انہوں نے بغداد الجدید مین بسوں کے شیڈ، ٹیلی فون ایکسچینج اور محافظ خانہ کی تعمیر کرائی۔ ان کے زمانہ وائس چانسلرشپ میں چار نئے شعبہ جات کی تعمیر عمل میں لائی گئی جس میں شعبہ ایجوکیشنل ٹریننگ و دیگر شعبہ جات ہیں۔ انہوں نے شعبہ جات میں جدید ترین سہولیات مہیا کیں جن میں جدید کمپیوٹرز اور ملٹی میڈیاز تھے جن کا دور رَس نتیجہ طلبا اور اساتذہ کی تعلیمی اپج کو بڑھانے میں معاون ہوا۔ 13 اگست 1997 کو ان کا دورِ اقتدار ختم ہوا اور ان کے بعد پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیق جامعہ کے آٹھویں وائس چانسلر بنے۔

۸۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیق خان

1997 میں چوتھی مرتبہ بھی شعبہ فارمیسی کے صدارتی تمغہ حسن کارکردگی حاصل کرنے والے مایہ ناز استاد ڈاکٹر شفیق خان کو وائس چانسلر تعینات کیا گیا۔ ڈاکٹر شفیق خان نے جامعہ کا نصاب ازسرنو جدید تقاضوں کے مطابق مرتب کروایا۔ اردو میں معیاری درسی کتب نہ ہونے کی وجہ سے معاشیات، جغرافیہ، سیاسیات اور شعبہ قانون کے لیے امتحانی زبان انگریزی مقرر کی۔ بی سی ایس اور بی بی اے شروع کیا۔ کئی شعبوں میں شام کی کلاسیں جاری کیں۔ آپ ہی کے دور میں آئی ٹی اور اپلائیڈ سائیکالوجی کے شعبوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یونیورسٹی کالج آف انجینیئرنگ قائم کرکے اس میں فوری کلاسوں کا آغاز کیا گیا۔ ہومیو پیتھک اور طب اسلامی کے شعبوں میں ڈگری پروگرام شروع ہوئے۔ کالج آف کنونشنل میڈیسن بھی آپ کے دور میں ہی قائم ہوا تھا۔ 1998ء میں جامعہ اسلامیہ کا پہلا کنووکیشن کروانے کا اعزاز بھی ڈاکٹر شفیق خان کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر شفیق خان کے دور میں تدریسی شعبوں کی تعداد 24 ہوگئی تھی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیق 26 مارچ 1945 میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک کہنہ مشق محقق اور سائنسدان تھے۔ وہ ساٹھ سے زائد تحقیقی مقالہ جات کے مصنف ہیں اور 2000 میں انہیں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے بہترین استاد کے اعزاز سے نوازا۔ 1999 میں انہیں حکومتِ پاکستان نے پرائڈ آف پرفارمنس کا اعزاز دیا۔ ان کے دور میں فیکلٹیز کی تزئین و آرائش اور بہتری آئی انہوں نے جامعہ کے پہلے کانووکیشن کا انعقاد کیا۔ 23 فروری 1999 کو پاکستان کے وزیرِ اعظم میاں نواز شریف اس کانووکیشن میں تشریف لائے اور ان کی آمد سے بغداد الجدید کیمپس میں آڈیٹوریم کا قیام اور انجنیئرنگ کالج کے قیام کے لئے خطیر فنڈز کا اعلان ہوا اور جلد ہی ان کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس کانووکیشن کے دوران بارش شروع ہوئی اور عین ممکن تھا کہ یہ کانووکیشن بیچ میں ہی تند و تیز بادوباراں کی وجہ سے برخاست کر دیا جاتا مگر اچانک ہوا رک گئی اور وزیرِ اعظم نے بھی اس صورتِ حال کو بھانپ کر فنڈز کا اجراء فوری طور پر کیا اور یوں ستمبر 1999 میں

مین آڈیٹوریم کا کام شروع ہوا جو اگست 2002 میں مکمل ہوا جس کا افتتاح میاں محمد سومرو نے کیا۔ یہ وہ دور تھا جب پاکستان پر ایٹمی دھماکوں کی وجہ سے کئی معاشی پابندیاں عائد تھیں مگر وائس چانسلر کی بیدار مغزی اور وزیرِ اعظم کی خصوصی توجہ کی وجہ سے جامعہ اسلامیہ میں نہ صرف مین آڈیٹوریم کی عمارت تعمیر ہوئی بل کہ فیکلٹی آف ایجوکیشن کی عمارت بھی پروفیسر ڈاکٹر شفیق کے دور میں پایہء تکمیل ہوئی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیق نے اپنے کیریئر میں شعبہ سائیکالوجی اور انجنیئر نگ کالج قائم کیا اس کے ساتھ ان کا اہم کارنامہ طب اور ہومیو پیتھک کے شعبہ جات کا قیام تھا جس میں یونیورسٹی کالج آف کنونشنل میڈیسن کا آغاز بھی تھا۔ اس حوالہ سے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ طب کے شعبہ کا آغاز 1926 میں جامعہ عباسیہ میں ہی ہوا تھا جسے بعد میں طبیہ کالج بہاول پور کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یوں ڈاکٹر شفیق نے پرانی روایات کو جلا دی اور طلباء اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے جامعہ اسلامیہ میں آنے لگے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیق نے اپنا چار سال کا عرصہ بہ خوبی نبھایا اور

۹۔ پروفیسر ڈاکٹر منیر اختر

۳ اکتوبر 2001 کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے نوویں رئیس الجامعہ مقرر ہوئے۔ پروفیسر ڈاکٹر منیر اختر کا تعلق ملتان سے تھا جو راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش 10 مارچ 1948 میں ملتان میں ہوئی۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج آف ایمرسن بوسن روڈ ملتان سے بی ایس سی کی اور بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی شماریات کی ڈگری حاصل کی۔ پروفیسر ڈاکٹر منیر اختر اور پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیق دونوں صاحبان ایک ہی دن یعنی یکم جنوری 1977 کو جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں ایک ساتھ ہی ملازمت سے منسلک ہوئے۔ پروفیسر ڈاکٹر منیر اختر کو حکومتِ برطانیہ نے اعزازِ فضیلت سے نوازتے ہوئے چارلس والز ٹرسٹ ایوارڈ دیا۔ یوں پروفیسر ڈاکٹر منیر اختر ایشیا سے وہ پہلے سکالر تھے جنہوں نے یہ ایوارڈ جیتا۔ 1982ء سے 1985ء تک صرف تین سال کے قلیل عرصہ میں انہوں نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کیا۔ اسی طرح 1996 میں وہ فل برائٹ سکالرشپ لے کر امریکہ تشریف لے گئے اور وہاں بھی وہ پہلے پاکستانی تھے جنہوں نے یہ ایوارڈ جیتا۔ ان کی آمد اس یونیورسٹی میں بطور لیکچرر ہوئی اس کے بعد وہ ترقی پا کر اسسٹنٹ پروفیسر بنے پھر ایسوسی ایٹ اور پروفیسر بن کر وائس چانسلر کے عہدہ تک پہنچے۔ پروفیسر ڈاکٹر منیر اختر کے زیرِ سایہ یونیورسٹی کے دو نئے کیمپس بہاول نگر کیمپس اور رحیم یار خان کیمپس کا آغاز ہوا۔ ان کے دور میں دس نئے شعبہ جات کا قیام عمل میں لایا گیا۔ پروفیسر ڈاکٹر منیر اختر نے چار ماڈرن لیبارٹریز کا قیام کیا اور اس دور میں 50 کمپیوٹرز پر مبنی جدید ترین کمپیوٹر لیب تعمیر ہوئی۔ 2002ء میں کامرس کے شعبہ کا آغاز ہوا ستمبر 2004ء میں ایجوکیشن فیکلٹی میں شعبہ سوشل ورک اور 2005ء میں فائن آرٹس کے شعبہ نے اپنا کام شروع کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر منیر اختر کے دور میں ہی شعبہ تاریخ اور مطالعہ پاکستان کو دو الگ شعبوں میں تقسیم کیا گیا جس سے طلبا کا ایک دیرینہ مسئلہ حل ہوا۔ سائنس فیکلٹی میں بھی دو نئے شعبوں کا قیام عمل میں لایا گیا جس میں کمپیوٹر سسٹم انجنئرنگ اور دوسرا شعبہ زراعت کا

تھا ان دو شعبوں کے ساتھ فزیکل ایجوکیشن اینڈ سپورٹس کا شعبہ قائم کیا گیا۔ یوں پروفیسر ڈاکٹر منیر اختر کے دور میں جتنے شعبہ جات قائم ہوئے وہ کسی اور دور میں قائم نہیں ہوئے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے حوالے سے بھی پروفیسر ڈاکٹر منیر اختر نے اہم کام کیا اور ڈگری کے تسلسل اور کلاسوں میں باقاعدگی کو رواج دیا۔ انہوں نے ہم نصابی سرگرمیوں کا آغاز بھی کیا جس میں سپورٹس گالا اور پہلی مرتبہ ڈرامیٹک کلب کا آغاز ہوا۔ 2005 میں ان کے تین سالہ دور کا اختتام ہوا جس کی وجہ واہ کینٹ کے ایک علمی ادارہ کو جوائن کرنا بنی اور یوں وہ اپنی وائس چانسلرشپ کو ادھورا چھوڑ کر نئی منزلوں کی جانب گامزن ہوئے۔

۱۰۔ پروفیسر ڈاکٹر بلال اے خان

13 اکتوبر 2005 کو ڈاکٹر بلال اے خان اسلامیہ یونیورسٹی کے دسویں وائس چانسلر منتخب ہوئے اور یہ پہلی بار تھا کہ یونیورسٹی میں کسی معلم یا پروفیسر کے بجائے ایک تعینات بیوروکریٹ کو بطور وائس چانسلر تعینات کیا گیا۔ ڈاکٹر بلال اے خان مقابلے کا امتحان پاس کر کے کئی انتظامی عہدوں سے وابستہ رہے۔ ان کا تعلق کشمیر سے تھا اور انہوں نے بی اے آنرز کی ڈگری گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی ان کے بنیادی مضامین میں انگریزی اور سیاسیات شامل تھا انھوں نے پبلک ایڈمنسٹریشن میں ایم اے امریکن یونیورسٹی (بیروت) لبنان سے حاصل کی اور امریکہ کی ہی ایک یونیورسٹی سے 1986 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری منیجمنٹ اور پبلک ایڈمنسٹریشن میں لی۔ وہ امریکہ کی تین یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے اس کے علاوہ 2002 سے 2003 تک وہ یونیورسٹی آف فیصل آباد میں بہ طور وائس چانسلر خدمات سر انجام دیتے رہے اور اس کے علاوہ ایشین مینیجمنٹ انسٹی ٹیوٹ اور اقراء یونیورسٹی کراچی میں پرو وائس چانسلر کام کرتے رہے۔ پی آئی اے میں بہ طور بانی جنرل منیجر ٹریننگ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈویژن بھی کام کیا۔ 2005 سے 2010 تک ان کے دور میں اسلامیہ یونیورسٹی نے گوناگوں ترقی کی۔ انھوں نے جامعہ کا نقشہ ہی بدل دیا اور بڑے پیمانے پر تعمیرات کا آغاز ہوا۔ انہوں نے یونیورسٹی کے گیٹس کو نئی طرح دی۔ نئے ہوسٹل، فیکلٹیز کی عمارات کی تکمیل کے ساتھ کالونی میں چھوٹے بڑے مکانات اور کوٹھیوں کی تعمیر کے ساتھ ایگزیکٹو ہوسٹل، فارن فیکلٹی ہوسٹل، سپورٹس کمپلیکس اور اولڈ کیمپس کی مرمت و تزئین و آرائش کا کام بھی ہوا۔ ان کے دور میں سمسٹر سسٹم کو اختیا رکیا گیا اور ڈاکٹر بلال اے خان تقلید کے بجائے نئے اطوار کو وضع کرنے کے قائل تھے۔ انہی کے دور میں یونیورسٹی کے نام کو آئینی نام سے موسوم کیا گیا جو کہ دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور ہے۔ ان کے دور میں طلباء کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور کمپیوٹرائزڈ آن لائن داخلہ فارم کی وصولی نے جامعہ اسلامیہ کو ایک نئی جہت سے متعارف کروایا۔

انہوں نے یونیورسٹی کے کانووکیشن کو باقاعدہ کیا اور علی الترتیب 27 مارچ 2008 اس جامعہ کا دوسرا کانووکیشن منعقد ہوا، 21 نومبر 2009 کو تیسرا اور پھر چوتھا کانووکیشن منعقد ہوا۔ ڈاکٹر بلال اے خان سے قبل جامعہ اسلامیہ میں صرف تین کلیّات تھے جن میں آرٹس، سائنس اور علومِ اسلامیہ کی کلیّات قائم تھیں لیکن ڈاکٹر بلال اے خان کے زمانے میں شعبہ جات اور ڈسپلنز کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔انھوں نے تین مزید فیکلٹیاں تشکیل دیں جن میں ایجوکیشن، فارمیسی اور مینجمنٹ سائنس کی فیکلٹی بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے دور میں تین نئے کالجز بھی تشکیل پائے جن میں یونیورسٹی کالج آف ویٹرنری اینڈ اینمل سائنسز، یونیورسٹی کالج آف آرٹ اینڈ ڈیزائن اور یونیورسٹی کالج آف ایگری کلچر اینڈ انوائرمینٹل سائنسز شامل ہیں۔ ڈاکٹر بلال اے خان کی تگ و دو یونیورسٹی سکولز کے لئے بھی بیش قیمت رہیں۔ وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر بلال اے خان 23 جولائی 2010 کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ براء ہوئے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار

۱۱۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار جامعہ کے گیارہویں وائس چانسلر 23 جولائی 2010ء میں تعینات ہوئے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار ایک اعلیٰ پائے کے سائنسدان اور محقق ہیں جن کے سوا سو سے زائد مضامین، تحقیقی مقالے دنیا کے بہترین جرنلز میں شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار بہاول پوری ہیں اور 6 اپریل 1958 میں بہاول پور کی نواحی بستی گد پورہ میں پیدا ہوئے۔ جھانگی والا پرائمری سکول سے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی اور میٹرک کی تعلیم ایس ڈی ہائی سکول بہاول پور سے حاصل کرنے کے بعد ایف ایس سی اور بی ایس سی کی تعلیم صادق ایجرٹن کالج بہاول پور سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد گئے اور وہاں سے سکالرشپ لے کر امریکہ کی ڈریکسل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار کی حب الوطنی کی ایک مثال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی پی ایچ ڈی مقالہ کا ڈیفنس یومِ آزادی کے دن رکھوایا۔ کئی سالوں تک امریکی یونیورسٹیوں میں تحقیقی و تدریسی کام کیا اور اس کے بعد وہ اسلام آباد کی بارانی زرعی یونیورسٹی میں آ گئے۔ جامعہ اسلامیہ میں وہ 22 جولائی 2014 تک رہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار ایک سادہ دل شخصیت تھے اور مولانا الطاف حسین حالی کے اس شعر کے مصداق ان کے شخصی اوصاف مترشح ہیں۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار کے دور میں وائس چانسلر ہاؤس کے دروازے ملازمین، طلباء و طالبات اور اہلِ قلم کے لئے ہمہ وقت کھلے رہتے۔ انہوں نے پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ کو بحال کیا اور ان کے دور میں یونیورسٹی ہر وقت خبروں میں رہتی۔ انہیں یہ ملکہ حاصل تھا کہ وہ مسلسل سفر کرنے سے نہیں گھبراتے تھے۔ ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کے پاس بیک وقت دو اور یونیورسٹیوں کے چارج رہے جس میں گورنمنٹ صادق کالج

ویمن یونیورسٹی بہاول پور اور غازی یونیورسٹی ڈیرہ غازی خان شامل ہیں۔ ان کے دور میں یونیورسٹی میں دو کانوکیشن ہوئے جس میں پہلے اس وقت کے گورنر پنجاب جناب لطیف کھوسہ اور دوسرے میں جناب یوسف رضا گیلانی وزیرِاعظم پاکستان تشریف لائے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار کے دور میں قومی اور بین الاقوامی کانفرنسز کے انعقاد کے علاوہ سیمینارز اور کئی عالمی پروگرام منظّم ہوئے جس سے یونیورسٹی اور پاکستان کا ایک سافٹ امیج اجاگر ہوا۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار کے دور میں soil Sciences, Antomology, Plant Breeding and Janetics, Forestry Range and Live Stock Management, Agronomy کے علاوہ دو نئے شعبے ہارٹی کلچرل سائنس اور فوڈ سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی تشکیل پائے جن کی تکمیل کچھ تو ان کے دور میں ہوئی اور باقی کو بعد میں آنے والے وائس چانسلرز نے توثیق کی اور یوں جامعہ میں نیا اضافہ ہوا۔ ان کے دور میں اساتذہ کی ترقیاں ہوئیں جس سے اسلامیہ یونیورسٹی رینکنگ میں بہتر ہوئی اور سترہویں نمبر سے تیرہویں اور پھر آٹھویں نمبر پر آ گئی۔ ان کے دور میں یونیورسٹی جو سترہ کروڑ روپے کی مقروض تھی ان کے دور کے آخری دنوں میں سترہ کروڑ کی مالک ہو گئی۔ اور ریزروز بڑھ کر پچاس کروڑ ہو گئے۔

۱۲۔ پروفیسر ڈاکٹر سلیم طارق خان

پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار کے بعد کچھ عرصہ کے لئے جب وائس چانسلر کا انتخاب ممکن نہ تھا تب حکومتِ پنجاب نے ایک بہتر اور فوری اقدام کرتے ہوئے ایک جز وقتی وائس چانسلر 26 جولائی 2014 کو پروفیسر ڈاکٹر سلیم طارق کے آرڈر جاری کئے اور یوں یونیورسٹی کے بارہویں وائس چانسلر کے طور پر منصب پر فائز ہوئے۔ پروفیسر ڈاکٹر سلیم طارق جامعہ اسلامیہ کے بارہویں وائس چانسلر کے طور پر منتخب ہو گئے۔ پروفیسر ڈاکٹر سلیم طارق 13 اکتوبر 1954 کو کبیر والا کے ایک گاؤں ککڑ ہٹہ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک کی تعلیم ملتان میں حاصل کی اور بی اے سرگودھا سے اور ایم اے اور پی ایچ ڈی عربی اورئینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر سلیم طارق 15 اگست 1979 کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں بہ طور لیکچرر تدریس سے منسلک ہوئے۔ پروفیسر ڈاکٹر سلیم طارق نے 35 سے زائد تحقیقی مقالہ جات تحریر کئے اور دو سو سے زائد طلبہ و طالبات ان سے فیض یاب ہوئے۔ ان کا دورِ وائس چانسلرشپ مختصر رہا جو کہ صرف اڑتالیس دن پر مبنی تھا۔ وہ 12 اکتوبر 2014 میں ریٹائر ہوئے اور اسی دن ان کی وائس چانسلرشپ کا اختتام ہوا۔

۱۳۔ پروفیسر ڈاکٹر راؤ محمد افضل خاں

2014 میں اسلام آباد میں دھرنوں اور لاہور میں سانحات کے باعث حکومتِ پنجاب کے لئے ممکن نہ تھا کہ فی الفور وائس چانسلر تجویز کریں اس لئے پروفیسر ڈاکٹر سلیم طارق کے جانے کے بعد پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل کو وائس چانسلرشپ کا چارج ملا۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل جامعہ کے سینئر اساتذہ میں سے تھے جو 12 اپریل 1958 میں فورٹ عباس میں پیدا ہوئے۔ ان کے اٹھائیس تحقیقی مقالہ جات شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل نے ملازمت کا آغاز گورنمنٹ کالجوں سے کیا اور 1983 میں اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہء فزکس میں وارد ہوئے۔ انہوں نے برطانیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری مکمل کی اور پھر پوسٹ ڈاک کے لئے برطانیہ گئے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل خان 16 اکتوبر 2014ء کو اسلامیہ یونیورسٹی کے تیرہویں وائس چانسلر کے طور پر متمکن ہوئے۔ ان کے دور میں 24 اکتوبر 2014 میں کانوکیشن منعقد ہوا جس کی صدارت صدرِ مملکت سیّد ممنون حسین نے کی۔ یہ وہ تیسرے صدر تھے جنہوں نے جامعہ اسلامیہ کے کانوکیشن کی صدارت کی اس سے قبل غلام محمد اور فیلڈ مارشل ایوب خان یہاں تشریف لا چکے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل خان 18 دسمبر 2014 کو ریٹائر ہوئے اور اس کے ساتھ ہی وائس چانسلرشپ کے عہدے سے بھی سبکدوش ہوئے۔

۱۴۔ پروفیسر ڈاکٹر قیصر مشتاق

19 دسمبر 2014 کو پروفیسر ڈاکٹر قیصر مشتاق اسلامیہ یونیورسٹی تشریف لائے۔ پروفیسر ڈاکٹر قیصر مشتاق نے جامعہ میں ایک نئے تعلّم و تحقیق کا دور شروع کیا۔ جب وہ تشریف لائے تو اس وقت جامعہ میں اساتذہ کرام کی شدید قلّت تھی۔ انہوں نے مختلف شعبہ جات میں خالی نشستوں کو پر کیا اور شبانہ روز کوششوں سے طویل سلیکشن بورڈز منعقد کر کے شفاف طریقہ سے 101 یونیورسٹی ملازمین، 300 آفیسران کی ٹریننگ اور لاتعداد اساتذہ کی تقرری عمل میں لائی گئی۔ ان کے دور میں دورانِ سروس فوت شدہ ملازمین کے اولاد کی تقرری کی۔ یو ایس ایڈ کے زیرِ تحت ایک عمارت جسے 270 ملیّن روپے کی لاگت سے مکمل کیا گیا جہاں اس وقت فیکلٹی آف ایجوکیشن قائم ہے۔ 2015 میں وزیرِ مملکت داخلہ میاں محمد بلیغ الرحمٰن اور تعلیم و ٹیکنکل ٹریننگ مسٹر احسن اقبال، وفاقی وزیر برائے پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ کی کاوشوں سے فروری 2015 میں پہلی بار اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کو 858,442 ملین روپے ملے جو ایک خطیر رقم تھی جس سے فیکلٹی آف مینیجمنٹ سائنسز، کمپیوٹر سائنسز، کامرس اور دو نئے ہوسٹلز کے منصوبے مکمل ہوئے۔ انہی کے دور میں جامعہ اسلامیہ میں 60 کنال پر مبنی سٹڈی پارک بنایا گیا اور آئی ٹی بلاک تعمیر ہوئی۔ ان کے دور میں اسلامیہ یونیورسٹی میں ویٹرنری کالج کا الحاق جو گذشتہ ایک دہائی سے پڑا تھا آخر کار 2015 میں مکمل ہوا۔ پروفیسر ڈاکٹر قیصر مشتاق ایک سخت گیر منظّم تھے اور چاہتے تھے کہ ہر کام بر وقت اور perfection کے ساتھ ہو۔ ان کے دور کا اختتام 18 دسمبر 2018 کو ہوا۔

۱۵۔ پروفیسر ڈاکٹر عامر اعجاز

عبوری طور پر میاں نواز شریف یونورسٹی ملتان کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر عامر اعجاز کو اسلامیہ یونیورسٹی کا اضافی چارج دیا گیا جو یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس تشریف لاتے اور وہیں بیٹھ کر ضروری ڈاک نکال کر واپس چلے جاتے۔ ان کا دور انتہائی قلیل تھا اور حکومتِ پنجاب نے جلد ہی نئے وائس چانسلر کا انتخاب کیا یوں 23 جولائی 2019 میں نئے وائس چانسلر کی تقرری ہوئی جن کا نام پروفیسر ڈاکٹر انجنیئر اطہر محبوب ہے۔

۱۶۔ انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب (تمغہ امتیاز)

جامعہ کے سولہویں رئیس الجامعہ کے طور پر انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب (تمغہ امتیاز) 26 جولائی 2019 نے جامعہ کی باگ ڈور سنبھالی۔ انھوں نے الیکٹریکل انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی نیشنل یونورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی پاکستان سے کی وہ ایک نام ور محقق، سائنسدان اور ماہرِ تعلیم ہیں ۔ وہ ایک مثالی منتظم ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم کراچی، فرانس، برطانیہ اور امریکہ کی مشہور درس گاہوں سے ہے ۔ بی ایس اور ایم ایس کی تعلیم انہوں نے فلوریڈا اسٹیٹ یونیورسٹی امریکہ سے حاصل کی مگر حب الوطنی کا جذبہ، اسلام سے محبت، عشقِ مصطفٰے اور اقبال شناسی کے باعث وہ اپنے وطن پاکستان کو سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور پاکستانی درسگاہوں جیسا کہ صفّہ یونیورسٹی ڈیفینس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی کے علاوہ سرسیّد یونیورسٹی کراچی اور NUST کراچی میں بہ طور پروفیسر اور ڈین اپنے فرائض سرانجام دے چکے ہیں۔ انجنیئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب (تمغہ امتیاز) ابنِ خلدون سسٹمز کے بانی ہیں اور سینکڑوں صنعتی و مالیاتی ، دفاعی و جدید پراجیکٹس کی تکمیل کر چکے ہیں۔ ان کی انہی خدمات کے صلّہ میں حکومتِ پاکستان نے ان کے دفاعی منصوبہ SONAR پر انہیں تمغہ امتیاز سے نوازا۔ نوٹ: یہ کتاب خالصتاً پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب سے متعلق ہے اس لیے یہاں ان کے تذکرے کو مختصر کیا جا رہا ہے۔

باب نہم

اس کے آئینۂ ہستی میں، عمل جوہر تھا!

تمغۂ امتیاز

ستارۂ امتیاز اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سول اور عسکری شخصیات کو عطا کیا جانے والا تیسرا بڑا اعزاز ہے۔ اس اعزاز کو ستارۂ فضیلت کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا اعزاز جو حکومتِ پاکستان عسکری اور سول شخصیات کو عطا کرتی ہے۔ سول شخصیات کو یہ اعزاز ادب، فنونِ لطیفہ، کھیل، طب یا سائنس کے میدان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں دیا جاتا ہے۔ اس اعزاز کا اعلان سال میں ایک مرتبہ یومِ آزادی کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ یومِ پاکستان کے موقع پر صدرِ اسلامی جمہوریہ پاکستان اس اعزاز کو عطا کرتے ہیں۔ عسکری حوالے سے یہ اعلیٰ ترین اعزاز بریگیڈیئر یا میجر جنرل کے عہدہ پر فائز ان فوجی افسران کو عطاء کیا جاتا ہے جنہوں نے عسکری میدان میں جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کیا ہو۔ پاکستان میں تمغۂ امتیاز، نشانِ امتیاز، ہلالِ امتیاز، ستارۂ امتیاز عموماً حسنِ کارکردگی پر عطا کیا جاتا ہے اور اس اعزاز کے حصول میں سخت ریاضت و محنت کا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہ ایوارڈ ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو ایسا کارنامہ سرانجام دیں جو ان کے فرائضِ منصبی سے کہیں بڑھ کر ہو یا کوئی ایسا انوکھا کام ہو جس سے انسانیت اور ملک و قوم کی خدمت ہوتی ہو۔

عسکری اداروں اور سویلین اداروں کے تمغوں میں ایک فرق ہے کہ فوج میں

ان تمغوں کے ایوارڈ کرنے کا طریقہ کار یکسر مختلف ہے انہیں ایوارڈ ان کے مقامی افسران کی Recommendation پر مل جاتے ہیں ان کی سکروٹنی کے لیے الگ سے کوئی پینل نہیں بنتا جب کہ سویلین تمغہ کے لیے پچاس سیٹ مختلف محکمہ جات کو بھیجے جاتے ہیں کہ فلاں شخص کو یہ ایوارڈ مل رہا ہے اگر کسی کو اعتراض ہے تو وہ اپنا اعتراض جمع کروائے یوں ایک پورا طریقہ کار ہے جس میں چھلنی لگا کر وہ ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ یہ اعزاز ایک فخر ہے جو ملک وقوم کی طرف سے کسی شخص کی انفرادی محنت کے صلہ میں ملتا ہے اور حاصل کرنے والا انتہائی معزز اور قابلِ صد تحسین شخص شمار ہوتا ہے۔

پاکستان میں ذہانت و قابلیّت کا فقدان نہیں۔ پاکستانی نوجوان ہر سطح اور ہر میدان میں اپنی صلاحیّتوں کا لوہا منواتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر پاکستانی اپنے مادرِ وطن کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہے۔ اُسے جہاں موقع ملتا ہے وہ دنیا کو باور کرواتا ہے کہ ہم پاکستانی محدود وسائل میں بھی ایسی ایجادات کرنے کی صلاحیّت رکھتے ہیں جو دنیا بہت زیادہ لاگت سے بناتی ہے۔ انھی درخشاں ستاروں میں سے ایک ستارہ جسے حکومتِ پاکستان نے ان کی گراں مایہ صلاحیتوں کے عوض تمغہء امتیاز سے نوازا پروفیسر ڈاکٹر انجینئر اطہر محبوب بھی ہیں۔ جنھوں نے انتہائی کم عمر، قلیل وقت اور کم لاگت میں دفاعی نقطہ نگاہ سے ایک ایسی ایجاد کی جس سے پوری دنیا ورطہ حیرت میں ڈوب گئی اور ان کی اس خدمت کو سراہتے ہوئے ملک وقوم نے اطہر محبوب کو قومی عزت و فضیلت سے نوازا۔

23 مارچ 2013ء کا دن ڈاکٹر اطہر محبوب کی زندگی کا یادگار دن تھا جب ان کو اپنی محنت کا صلہ تمغہءَ امتیاز کی صورت میں ملا۔ گورنر ہاؤس کراچی کی ایک پُروقار تقریب میں گورنر سندھ عشرت العباد نے پاکستان کا یہ شان دار اعزاز ڈاکٹر اطہر محبوب کو عطا کیا۔ ڈاکٹر اطہر محبوب اس وقت تمغہءَ امتیاز لینے والوں کی اس صف میں کھڑے تھے جنھوں نے عمر بھر کی ریاضت، محنت اور ملک وقوم کی خدمت کے بعد یہ تمغہ حاصل کیا تھا۔ ان کی خوشی دیدنی تھی کیوں کہ وہ اس صف میں سب سے کم عمر تھے۔ ان کے ساتھ پاکستان کے بڑے

نام اور بڑے لوگ کھڑے تھے جن میں پچاسی سال کے قریش پور تھے، انور اقبال مرحوم تھے جو اپنے دور کے بہت بڑے آرٹسٹ تھے، ذہین طاہرہ تھیں جو بہت بڑی اداکارہ تھیں۔ موسیقی کی دنیا کا ستارہ، عالمگیر موجود تھا جس نے پاکستان میں موسیقی کو ایک نئی جہت عطا کی۔ رمضان چھپا جیسے مخیّر اور دردِ دل رکھنے والے انسان بھی شامل تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے شعبوں میں اوجِ کمال رکھتے تھے۔ جنہوں نے دنیا بھر میں پاکستان کا نام اونچا کیا تھا۔ اب انہیں اس ملک کی خدمت کے عوض تمغۂ امتیاز سے نوازا جا رہا تھا۔ ان تمام ستاروں کے بیچ میں ڈاکٹر اطہر محبوب پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ انھیں صرف چالیس سال کی عمر میں ہی پاکستان کے اس عظیم ایوارڈ سے نوازا جا رہا تھا مگر ان کی محنت و فضیلت اپنے اعتبار سے اتنی ہی عظیم تھی جتنی باقی لوگوں کی تھی کیوں کہ انھوں نے وہ کر دکھایا تھا جسے کرنے کے لیے ترقی یافتہ ممالک کی ٹیکنالوجیکل برتری بھی ہیچ دکھائی دیتی تھی۔

یہ فطری امر تھا کہ ڈاکٹر اطہر محبوب کی بے یقینی کی کیفیت تا حال قائم تھی اور خود کو بارہا بار یقین دلاتے رہے کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ گرچہ اس ایوارڈ کا اعلان آج سے چھ ماہ قبل ہو چکا تھا مگر اس تمغہ کی اہمیت اور فضیلت اس دن آشکار ہوئی جب وہ اتنے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ کھڑے تھے اور اس ایوارڈ کو حاصل کرنے والے تھے۔ وہ اسی سوچ میں غلطاں تھے کہ ان عظیم لوگوں نے تو اپنی ساری زندگی ایک ہی مقصد میں گذار دی اور اب انھیں محنت کا ثمر مل رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو بچپن سے ان کے لیے ایک مثال تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر بڑے ہوئے۔ ان کے فن کی یکتائی اور اس فن پر ان کی دسترس سے وہ واقف تھے۔ خود کو ان کے سامنے بہت عاجز سمجھ رہے تھے۔ یہی انکی طبیعت کی منکسرالمزاجی ہے جو انھیں یک سر منفرد اور ممتاز بناتی ہے۔ اور اس قسم کا تفاخر کبھی اظہار میں نہیں آیا۔

ع..... رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے

2001ء میں نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (NUST) میں اپنی پی

ایچ ڈی کی ڈگری کا آغاز کرنے والے اطہر محبوب اس یونیورسٹی کے پہلے پی ایچ ڈی سکالر تھے جنھوں نے تین سال کے عرصہ کے دوران اپنا مقالہ تحریر کیا۔ڈگری کی تکمیل کے بعد اپنی مادرِ علمی میں ہی بہ طور پروفیسر منتخب ہوئے۔ 2012ء تک اسی ادارہ سے منسلک رہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی میں مہارت اور دست رس کے سبب انھوں نے ابنِ خلدون سسٹمز کے نام سے ایک سافٹ ویئر کمپنی کا آغاز بھی انہی سالوں میں کیا۔نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ،پاکستان نیوی انجینئرنگ کالج کے ساتھ منسلک ہے جہاں نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں سویلین تعلیم دی جاتی ہے وہیں پاکستان نیوی انجینئرنگ کالج میں عسکری اساتذہ و طالبِ علم تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ڈاکٹر اطہر محبوب اپنی تکنیکی صلاحیتوں کی وجہ سے دونوں ہی شعبوں میں اپنی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ان کی صلاحیّتوں کے اعتراف میں انہیں پاکستان نیوی کی جانب سے ایک اہم قومی مفاد سے وابستہ کام سونپا گیا جس پر اٹھنے والے بھاری اخراجات برداشت کرنا پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے ممکن نہیں تھا۔

اطہر محبوب نے ارضِ پاک سے اپنی یگانگت کا اظہار کرتے ہوئے رضاکارانہ طور پر اس کام کا بیڑہ اپنے سر لیا اور ارضِ وطن کے سمندری دفاع میں اپنی قابلیّت سے اضافہ کر دیا۔ ڈاکٹر اطہر محبوب زمانہ طالب علمی سے ہی تحقیق و مشاہدہ کے عمیق سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے اور کمپیوٹر ہارڈ ویئر میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اپنی تحقیق کے جذبہ کی تسکین کے لیے وہ NUST اور پاکستان نیوی کے انجینئرنگ کالجز میں اپنے انوکھے اور جدید پراجیکٹس کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔ اسی کہنہ مشقی اور پروفیشنل ازم کی وجہ سے پاکستان نیوی کے کمانڈانٹ نے ڈاکٹر اطہر محبوب کا انتخاب کیا۔ ان کی ذاتی استدعا پر دفاعی نوعیّت کی بھاری ذمّہ داری ڈاکٹر اطہر محبوب کے کندھوں پر رکھ دی گئی۔ اس چیلنج کو اختیار کرنے سے بہت سے نیوی کے ماہرانجینئرز نے اجتناب کیا تھا مگر ڈاکٹر اطہر محبوب نے اس چیلنج کو قبول کیا اور وہ کر دکھایا جس کو ساری دنیا سمجھتی رہی کہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔

1947ء میں آزادی کے حصول کے بعد جس طرح دیگر کاروبارِ زندگی میں کسمپرسی کی حالت تھی وہیں پاکستان نیوی کے پاس بھی کوئی ایسا ادارہ نہ تھا جہاں وہ اپنے افسران کی تکنیکی تربیّت کر سکے اور ملک کے طول و عرض میں کوئی ایسا انجینئرنگ کالج بھی موجود نہیں تھا جو نیوی سے متعلق نصاب کی تعلیم دے پاتا۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر 1962ء میں ایک ادارہ Officers Training Section (OTS) کے نام سے پی این ایس کارساز کراچی میں قائم ہوا جو بتدریج ترقی کے مراحل طے کرتا ہوا مئی 1967ء میں پاکستان نیوی انجینئرنگ کالج (PNEC) بن گیا جس کا الحاق جامعہ کراچی کے ساتھ کر دیا گیا۔ یہاں بی ای مکینیکل اور بی ای الیکٹریکل کی ڈگریوں کا اجراء کیا گیا جو پاکستان نیوی کے فارغ التحصیل انجینئرز کو دی جاتی تھیں۔ مارچ 1977ء میں اس کالج کا الحاق این ای ڈی یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی سے ہوا جس کے بعد اس ادارہ میں ملکی اور غیر ملکی فنی ماہرین تربیت حاصل کرنے لگے۔

پاکستان نیوی انجینئرنگ کالج (PNEC) کی موجودہ عمارت اور شکل 1980ء میں تعمیر کی گئی جس کا افتتاح 7 ستمبر 1982ء میں اس وقت کے چیف آف نیول سٹاف ایڈمرل کرامت رحمان نیازی نے کیا۔ اس ادارہ پی این انجینئرنگ کالج کے پہلے کمانڈنگ آفیسر کموڈور قیصر محمود بنے۔ 1988ء میں اس ادارہ کو پہلی بار عوام الناس کے داخلوں کیلئے کھولا گیا۔ 1995ء میں اس ادارہ کے ساتھ نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (NUST) کا آغاز ہوا یوں PNEC انجینئرنگ کالج میں نیوی کے باوردی آفیسران اور NUST میں سویلین اساتذہ تعلیم دیتے۔ عام شہری بھی وہاں تربیت پاتے ہیں۔ اس انجینئرنگ کالج کا اپنے تعلیمی معیار کے بدولت 1999ء میں ISO-9001 سرٹیفکیٹ ملا جس کے ساتھ ہی یہاں پی ایچ ڈی پروگرام کا اجراء کیا گیا جس کے پی ایچ ڈی سکالرز میں سرخیل اطہر محبوب بنے جو اپنی پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد جنوری 2006ء میں بہ طور جز وقتی اور ایک سال بعد کل وقتی فیکلٹی ممبر منتخب ہو گئے۔ وہ 2012ء تک اس ادارے میں

خدمات سرانجام دیتے رہے۔ پھر یہاں سے ڈی ایچ اے کراچی کی جامعہ صفہ میں منتقل ہو گئے۔

ڈاکٹر اطہر محبوب نے اپنی تعلیم کا بیشتر عرصہ امریکہ میں گذارا تھا جہاں انھوں نے امریکی نظام تعلیم اور اساتذہ کو قریب سے دیکھا۔ پی ایچ ڈی کے بعد اپنے اساتذہ کی طرح اپنی ذاتی آئی ٹی کمپنی کی بنیاد ڈالی تا کہ وہ کاروباری شخصیّت بن کر ملک کی معاشی ترقی میں کردار ادا کر سکیں مگر پے در پے نقصانات نے انھیں ملازمت کی طرف مائل کیا۔ وہ NUST میں پارٹ ٹائم چھوڑ کر کل وقتی پروفیسر بن گئے۔ بین الاقوامی شہرت کے حامل ادارے NUST میں بحرین، قطر، فلسطین، لیبیا، سعودی عریبیہ اور کئی دوسرے مسلم ممالک سے فوجی تکنیکی ماہرین بحری علوم کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کو ڈاکٹر آف انجینئرنگ یا انجینئرنگ ڈاکٹریٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اسے بطور مخفف Eng. Dr. تحریر کیا جاتا ہے۔ انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری اس وقت ایوارڈ ہوتی ہے جب سکالر کا تحقیقی مقالہ ایڈوانسڈ تحقیق پر مبنی اصل تحقیق ہو۔ یہ باقی سائنسز سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں تحقیقی مقالہ کی بنیاد صنعتی لحاظ سے اہمیّت کا حامل ہونا ضروری ہے۔

سمندر کے گہرے پانیوں میں یا سمندری سرحدوں کے دفاع کے لیے کسی بھی بحری جہاز کو یا کسی بھی سب میرین کو اپنا راستہ یا اپنا دفاع کرنے کیلئے SONAR پروگرام کی ضرورت پڑتی ہے SONAR مخفف ہے Sound Navigation And Ranging کو آسان لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب کوئی سب میرین پانی میں غوطہ زن ہوتی ہے اس وقت اس کا رے ڈار کام نہیں کرتا جس سے عرشہ کے باہر یا اردگرد کی چیزوں یا حرکات پر نظر رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ یوں اس پروگرام کی مدد سے سمندر کے اندر راستہ کی تلاش، اردگرد کے ماحول سے باخبری اور دشمن کی سب میرینز کی نقل و حمل حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ آواز کی یہ لہریں رے ڈار اور

روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے سفر کرتے ہوئے ناٹیکل چارٹ بناتی ہیں جس سے زیرِ سمندر پیش آمدہ مصائب و مشکلات پر قابو پایا جاتا ہے۔

SONAR چارٹ بنانے میں مدد فراہم کرتا ہے جس سے سمندری سطح پر ہونے والی کسی بھی معمولی سی معمولی حرکت یا جہازوں کی نقل و حمل وغیرہ کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ اس آلہ سے ایک بحری جہاز یا سب میرین دوسری سب میرین یا بحری جہاز کو دیکھ پاتی ہے اور ممکنہ ٹکراؤ سے بچ سکتی ہے۔

SONAR دو قسم کی ہوتی ہیں .Active and Passive ایکٹو سونار لہریں، صوتیاتی مواصلات کو پانی میں چھوڑتی ہیں اور اگر یہ لہریں کسی object سے ٹکرا کر لوٹتی ہیں تو ایک ارتعاش پیدا کرتی ہیں، جس سے اس object کا فاصلہ ماپا جا سکتا ہے اور سونار کا ٹرانس ڈوسران لہروں کی رینج اور اس شئے کی تصویر اجاگر کرتا ہے جبکہ Passive سونار کا استعمال بنیادی طور پر اس شور کی پہچان کرتا ہے جو سب میرین یا بحری جہاز کے آلات سے یا کسی سمندری جانور کی موجودگی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایکٹو سونار کے برعکس Passive سونار اپنی لہریں نہیں چھوڑتا اور یوں دوسرے جہاز یا سب میرینز کو پتہ نہیں چل پاتا۔ عسکری اعتبار سے Passive سونار فائدہ مند ہوتا ہے کیونکہ اس سے دشمن کی زد میں آئے بغیر دشمن کا پتہ چلایا جا سکتا ہے جبکہ ایکٹو سونار میں خطرہ یہ ہے کہ دشمن آپ کی نقل و حمل سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس لحاظ سے SONAR سمندری نقل و حمل کے حوالہ سے انتہائی اہمیّت کا حامل ہے۔

2009ء میں پاکستان نیوی انجینئرنگ کالج نے ڈاکٹر اطہر محبوب کو ان کی اہلیت اور SONAR پروگرام میں ان کی فضیلت کے باعث یہ ٹاسک دیا کہ وہ ایسا سافٹ ویئر تیار کریں جو جدید کمپیوٹرز پر استعمال کیا جا سکے کیونکہ اس سے پہلے یہ پرانے دور کے کمپیوٹرز پر کام کرتا تھا جو اُس وقت متروک ہو چکے تھے۔ اس تصوّر کے متعلق دنیا میں کسی نے بھی کام نہیں کیا تھا اور اس سافٹ ویئر کی تشکیل سمندری دفاع اور انسانیت کے لیے

انتہائی اہم کارنامہ ثابت ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر اطہر محبوب مطالعہ کے انتہائی شوقین ہیں۔ انہوں نے اس کے متعلق ایک تحقیق پڑھ رکھی تھی جو سویڈن کے ایک سائنٹسٹ نے کی تھی۔ سویڈش سائنس دان نے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالہ میں ایک ایسے ترقی یافتہ سافٹ ویئر کا ذکر کیا تھا جو سونار کو عام کمپیوٹرز کے ساتھ جوڑ کر استعمال کر سکتا تھا۔ اس نے یہ لکھا تھا کہ عام کمپیوٹر کا ساؤنڈ کارڈ لیں اور حساسی آلہ کو سمندر میں ڈالیں اس سے موصول ہونے والی موجوں کا تجزیہ SONAR کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ اس سویڈش انجینئر نے اس سافٹ وئیر کو بہت مشکل زبان میں لکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور قباحت تھی کہ اس کا استعمال ایک مخصوص ماحول میں ہی ہو سکتا تھا جو اس وقت تو موجود تھا مگر آج وہ ہارڈ ویئر اور سافٹ وئیر دست یاب نہیں تھا۔ اب پاکستان نیوی یہ چاہتی تھی کہ اسی قسم کا پروگرام بنایا جائے اور اسے جدید کمپیوٹرز پر چلایا جائے۔

ڈاکٹر اطہر محبوب نے شب و روز محنت اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر تین ہفتوں کے مختصر عرصہ میں اس پروگرام کو جدید دور کے لینکس کمپیوٹروں پر آپریٹ کرنے کے قابل بنا دیا جو بلاشبہ ایک بہت بڑی اختراع تھی۔ اس ایجاد نے جہاں ایک طرف پاکستان نیوی کے کثیر سرمایہ کی بچت کی جو سونار کی پروگرامنگ کے لیے وقف کی جانی تھی وہی دوسری طرف سودیشی پروگرام کی موجودگی میں بہت سی آسانیاں پیدا کیں۔

ڈاکٹر اطہر محبوب نے اس سافٹ ویئر کو ایک USB میں سمو کر نہ صرف اسے خودکار بنا دیا بلکہ تنصیب کرنے کی جھنجھٹ سے بھی چھٹکارا دے دیا۔ یوں سب میرین یا بحری جہاز کے تمام انجن اور فنکشنز کے آغاز کے ساتھ ہی سونار کا پروگرام بھی خود بخود شروع ہو جاتا ہے۔ اسے بار بار نصب بھی نہیں کرنا پڑتا۔ اس آسانی سے بحری جہاز یا سب میرین پر موجود تکنیکی ماہرین جو جدید کمپیوٹرز سے زیادہ واقفیت نہیں بھی رکھتے، بھی اس پروگرام کو با آسانی چلا سکتے تھے۔ یوں ڈاکٹر اطہر محبوب نے بنا کسی معاوضہ کے اپنے ملک و قوم کے ایک بہت بڑے دفاعی مسئلہ کو حل کیا۔ پاکستان نیوی نے ڈاکٹر اطہر محبوب کی اس

کاوش کے اعتراف میں ایک تعریفی خط سے نوازا اور انکی خدمات کو سراہا۔

ڈاکٹر اطہر محبوب اس بات سے بے خبر تھے کہ انہوں نے کتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔ وہ اسے معمول کی قومی خدمت سمجھ کر بھول گئے مگر پاکستان کی افواج نے اس حوالہ سے ان کی اس خدمت کی اہمیت کی قدر کی اور اعلیٰ مقام عطا کیا۔ ڈاکٹر اطہر محبوب کو آگاہ کئے بغیر تمغہ امتیاز کے لیے ان کا نام تجویز کر دیا گیا۔

14 اگست 2012ء میں پاکستان کے اخبارات میں ستارہ امتیاز حاصل کرنے والوں کے نام شائع ہوئے۔ کسی شناسا کے ذریعے اطہر محبوب کو یہ خبر ملی کہ تمغۂ امتیاز حاصل کرنے والوں میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر اطہر محبوب کو یقین نہ ہوا۔ وہ خود نائنتھ اسٹریٹ (کراچی) گئے اور اخبار خرید کر یقین دہانی کی کہ واقعی ان کا نام پاکستان کے اتنے بڑے اعزاز کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ گومگو کی اس کیفیت میں ڈاکٹر اطہر محبوب نے نیوی اسٹیبلشمنٹ کے دفتر میں فون کیا کہ تصدیق کر لیں واقعی یہ اطہر محبوب وہ خود ہی ہیں۔ وہاں کے تعینات کمانڈانٹ ریئر ایڈمرل سیّد امداد امام جعفری (جولائی 2011 سے جولائی2013) جو گیارہویں کمانڈانٹ اور پہلے پی این ایس جوہر کے کمانڈانٹ جو ریئر ایڈمرل کے درجہ تک پہنچے ان سے ڈاکٹر اطہر محبوب نے تصدیق کی کہ واقعی انہیں تمغہء امتیاز کیلئے نیوی سے کوئی طریقہ کار آگے بھیجا گیا ہے۔ کمانڈانٹ نے تصدیق کی کہ جی ہاں! آپ کا نام ہی تجویز ہوا ہے اور مجھ سے پیشتر کمانڈانٹ کموڈور احمد رضا (جولائی2009ء سے جولائی 2010ء) ڈاکٹر اطہر محبوب کے SONAR والے پراجیکٹ کی تکمیل پر ان کا نام تجویز کر گئے تھے۔

باب دہم

کوئی قابل ہو تو ہم شان نئی دیتے ہیں!
پی ایچ ڈی

پاکستان میں تعلیمی بحران اور یونیورسٹیوں کی دگرگوں صورت حال سے کون واقف نہیں۔ انہی نا مساعد تعلیمی حالات کی وجہ سے ہمارے تعلیمی اداروں اور تعلیمی ثمرات کو دنیا شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔ طلبا و والدین کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ترقی یافتہ ممالک میں بھیج دیں۔

ہمارے تعلیمی ادارے اپنے کم معیار کی وجہ سے اپنی ساکھ کھو رہے ہیں۔ سونے پہ سہاگہ کہ ان میں داخلہ لینے کے لیے مزید ایسی رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں کہ جس سے تمام ڈگری ایوارڈنگ ادارے ہی مشکوک بن جاتے ہیں۔ پاکستان میں پی ایچ ڈی کی سطح پر کی جانے والی تحقیق کا معیار ترقی یافتہ قوموں کے مقابلے میں کہیں کم ہے جس کی ایک مثال یہ بھی لی جا سکتی ہے کہ پاکستان کی کسی جامعہ سے پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کرنے والے طالب علم کو ترقی یافتہ ممالک میں اپنی اس ڈگری کو پیش کرنا ہو تو وہ قبول نہیں کی جاتی۔ اسے پوسٹ پی ایچ ڈی کرنا پڑتی ہے۔ ایسے سکالرز جو اپنی ڈگری بیرون ملک سے کر کے آتے ہیں ان کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ زیادہ بہتر ہیں اور اپنے ملک میں کی گئی تحقیق اور محقق دونوں کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے حتیٰ کہ بہت سی یونی ورسٹیوں میں بیرونِ ملک سے پی ایچ ڈی ہولڈرز کو ملازمتوں میں برتری دی جاتی ہے۔ اپنے ہی

ملک کی یونیورسٹیاں یہاں کے سکالرز پر اعتماد نہیں کرتیں۔ یہ افسوسناک رویہ اپنا کر یونیورسٹیوں میں اپنے ہی اداروں کی ساکھ اور معیار کو گرایا جا رہا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہم اپنے ملک سے فارغ التحصیل سکالرز کو فوقیت دیں کیونکہ وہ بہتر انداز سے اپنے تہذیبی، ثقافتی و تعلیمی پس منظر کو جانتے ہیں۔ ان کی تحقیق ہر انداز سے پاکستان کے حالات و معاملات پر مبنی ہوتی ہے۔ اپنے ملک میں اتنی بڑی ڈگری کی ناقدری دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جب تک پاکستانی قوم کا اعتماد اپنے تعلیمی اداروں پر بحال نہیں ہوگا یہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو پائے گا۔ کسی بھی ملک کی ترقی کا راز اس کے نظامِ تعلیم کی کامیابی میں پوشیدہ ہے۔ امریکہ، چائنہ، جرمنی، آسٹریلیا، ملائشیا، ترکی غرض ترقی پذیر ممالک کو بھی دیکھ لیں تو ان سب نے اپنے تعلیمی نظام کو بہتر بنایا اور ترقی کے زینے تیزی سے عبور کیے۔ آج آپ اگر کسی سے مشورہ لیں تو وہ یہی کہے گا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ پاکستان میں پی ایچ ڈی کیوں کی؟ آپ کو باہر سے تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ یہ مشورے کوئی ان پڑھ، جاہل نہیں بلکہ یونیورسٹیوں میں متمکن پروفیسر صاحبان دیتے ہوئے پائے گئے، طرفہ تماشا یہ کہ یہی ماہرینِ تعلیم انہیں پاکستانی تعلیمی اداروں میں خدمات انجام دے رہے ہوتے ہیں۔

ایسا ہی مشورہ اطہر محبوب کو ان کے والدین اور دیگر سینئر رفقائے کار نے دیا کہ آپ اپنی پی ایچ ڈی NUST کے بجائے امریکہ سے کریں کیونکہ اس یونیورسٹی کی رینکنگ نہیں اور یہ ایک نوزائیدہ یونیورسٹی ہے۔ یہاں تک کہ اطہر محبوب کو ان کے امریکی پروفیسر نے پیش کش کی کہ آپ اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری یہاں سے کریں آپ کا تمام تر وظیفہ اور دیگر اخراجات امریکی حکومت کے ذمّہ ہوں گے مگر اطہر محبوب نے اپنے ملک میں ہی پی ایچ ڈی کی تعلیم حاصل کرنے کو فوقیت دی۔ اور تمام تر پیش کشوں کو خاطر میں نہ لائے ان کے دل میں وطن سے محبت موجزن تھی اور وہ اپنے ملک کے لیے کچھ کر دکھانے کے جذبہ سے سرشار تھے۔ وہ اپنے ملک کی صنعت اور دفاع کیلئے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے

انھوں نے اسی ملک کی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (NUST) کا انتخاب کیا۔ اطہر محبوب کی وطن پرستی کی داد دینا چاہیے جس نے تمام تر سہولیات کے باوجود امریکہ ایسے ملک کی یونیورسٹیوں کے بجائے اپنے ملک کی یونیورسٹیوں کو ترجیح دی۔

یوں پورے پاکستان نے دیکھا کہ یہاں کی یونیورسٹیاں کس قدر شان دار ہیں جہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اطہر محبوب کو ان کی شاندار خدمات کے اعتراف میں تمغہ امتیاز عطا ہوا اور ان کے کام کی پذیرائی پاکستانی حکومت نے بہترین انداز میں کی۔ اطہر محبوب نے ثابت کر دیا کہ اساتذہ اور محقق اگر معیار قائم رکھنا چاہیں تو پاکستان کی جامعات بھی کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم فخر محسوس کریں اور اپنے اداروں پر ہمیں بھرپور اعتماد ہونا چاہیے۔ یہ ملک باصلاحیت نوجوانوں سے بھرا پڑا ہے جو ناتراشیدہ انمول ہیرے ہیں۔ پاکستان میں اگر کمی ہے تو صرف ایک بہتر نظام کی، جس دن ہم نوآبادیاتی سوچ سے باہر آئے اور ایک اکائی کے طور پر یک جا ہو گئے تو دنیا کی کوئی بھی طاقت ہمیں ترقی کرنے سے نہیں روک سکے گی۔ ان شاء اللہ!

اطہر محبوب نے پاکستان میں اپنی اعلیٰ تعلیم کا سفر پورے اعتماد اور شوق سے شروع کیا تھا۔ تحقیق کے میدان میں تو وہ پہلے ہی یکتا تھے اب تو انہیں موقع ملا تھا کہ وہ ثابت کریں اور کچھ نیا کر کے اپنے آپ کو منوائیں۔ پی ایچ ڈی سے پہلے وہ بیرون ملک آٹھ سالہ تعلیم و تعلّم کا تجربہ رکھتے تھے مگر پھر بھی آپ دورانِ پی ایچ ڈی مختصر مدّت کیلئے جرمنی بھی گئے وہاں اپنے مضمون سے متعلق ایک سمر کیمپ میں شرکت کی۔ اس کے بعد وہ کوریا و دیگر ممالک میں علمی استعدادِ کار کو بڑھانے اور مزید علم کے حصول کے لیے جاتے رہے تاکہ اپنی پی ایچ ڈی کے حوالہ سے ہونے والی جدید تحقیق اور اس موضوع سے متعلق ماہرین کے ساتھ گفتگو اور مشاورت کے ذریعہ ان کی معاونت حاصل کر سکیں۔ اس طرح وہ ان ماہرین کے ساتھ رابطہ میں رہ کر اپنی تعلیمی اہلیت کو بڑھاتے رہے۔

انہوں نے اپنے مقالہ کا عنوان

EFFICIENT HARDWARE AND SOFTWARE IMPLEMENTATIOM OF ELLIPTIC CURVE CRYPTOGRAPHY

منتخب کیا۔ اس مقالہ کا تعلق کرپٹوگرافی سے ہے جو انفارمیشن سکیورٹی سے متعلق ہوتی ہے اور اطہر محبوب نے جب 1996ء میں پاکستان میں مدرس کے طور پر آغاز کیا تب سے ہی ان کی دلچسپی کا محور و مرکز یہی موضوع رہا جو بالآخر انہوں نے اپنی پی ایچ ڈی کے عنوان کے طور پر چنا۔ مزاج کے اعتبار سے انجنیئر ڈاکٹر اطہر محبوب چیلنجوں کو پسند کرتے ہیں یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے مقالہ کے لیے اور اس سے پہلے 1996ء سے لے کر 2001ء تک اس کورس کو بطور معلم اپنے طالب علموں کو NUST میں پڑھایا تھا۔ وہ ایک تن آسان انسان نہیں ہیں۔ اسی لیے انھوں نے ایسے موضوع کا انتخاب کیا جو منفرد و متنوع مگر بہت مشکل تھا۔ دورانِ تدریس اس موضوع کے انتخاب نے ان پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس مضمون میں عملی تحقیق کے لیے کافی گنجائش باقی ہے لہذا انھوں نے اس موضوع کو عملی طور پر اپنے طالبِ علموں کو سکھایا اور بعد میں 2001ء میں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کا جزو بناتے ہوئے اس میں ہونے والی جدید تحقیق کو جگہ دی۔

اس جدّت پسندی کی بدولت انہیں قومی اور بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ وہ اندرون و بیرونِ ملک بہ طور سائبر سکیورٹی ماہر کے پہچانے جانے لگے۔ ان کے اس شوق کو جلا بخشنے کیلئے انہیں کمانڈر ڈاکٹر نصر اکرام ایسے جیّد استاد و محقق کی سرپرستی حاصل ہوئی جو NUST میں بطور پروفیسر تعینات تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر نصر اکرام نے بھی کرپٹوگرافی میں ڈگری حاصل کی تھی۔ اطہر محبوب اپنے سپر وائزر سے پیشہ وارانہ ملاقات کے بعد تہیہ کر چکے تھے کہ وہ اس فیلڈ کو اپناتے ہوئے اس شعبہ میں مزید تحقیق کریں گے۔ سپر وائزر کے انتخاب کی بڑی وجہ کمانڈر ڈاکٹر نصر اکرام کا بھرپور مطالعہ اور اپنے شعبہ میں یکتائے روزگار

ہونا تھا۔ ڈاکٹر نصر اکرام بھی پیشہ کے اعتبار سے الیکٹریکل انجینئر تھے۔ڈاکٹر نصر اکرام نے اپنی ڈگری کی تکمیل 1986ء میں نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی سے امتیازی حیثیت کے ساتھ کی تھی۔ 1989ء میں رائل انجنیئر نگ کالج برطانیہ سے انھوں نے Weapon Engineering Application Course کیا۔ 1995ء میں انھوں نے الیکٹرانک سسٹم انجینئرنگ میں ایم اے، کرین فیلڈ یونیورسٹی برطانیہ سے کیا جہاں انہیں اس سال کے بہترین طالبِ علم کے طور پر منتخب کیا گیا۔ پھر 1999ء میں انھوں نے بریڈ فورڈ یونیورسٹی برطانیہ سے کرپٹوگرافی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مکمل کی۔ وہیں انھیں ان کی تحقیق پر گرفت کی وجہ سے IEEE ایوارڈ سے نوازا گیا جو اُن کے دو بہترین ریسرچ پیپرز کی اشاعت پر دیا گیا۔ ڈاکٹر نصر اکرام ایک متحرک شخصیّت کے مالک ہیں جن کی 63 مطبوعات اور مختلف عنوانات پر تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ 2001ء میں ایچ ای سی نے انہیں بہترین استاد کے اعزاز سے نوازا۔ اسی سال انجینئر اطہر محبوب نے انہیں اپنا سپروائزر منتخب کر کے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ پروفیسر ڈاکٹر نصر اکرام نے گیارہ سال تک اسٹریٹیجک تنظیم میں تحقیق کی ترویج کے ادارہ کے سربراہ کے طور پر خدمات انجام دیں۔ مارچ 2020ء سے یکم اپریل 2021ء تک NUST کے ریکٹر کے طور پر خدمات انجام دینے کے بعد ریئر ایڈمرل کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوئے۔

اپنے استاد سے متاثر اطہر محبوب نے Elliptic Curve Cryptography Systems(ECC) میں اپنی پی ایچ ڈی کرنے کا تہیّہ کیا۔ ان کی تحقیق نے ان کے لئے نئے ادوار کے دروازے کھول دیئے۔ ڈاکٹر نصر اکرام کی ماہرانہ رائے اور اپنی ذاتی دلچسپی کو مدّنظر رکھتے ہوئے اطہر محبوب نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی پی ایچ ڈی کا مقالہ اسی موضوع پر کریں گے اور انھی کے زیرِ سایہ کام کریں گے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر انہوں نے سرسیّد یونیورسٹی کو خیر باد کہا اور IBA آ گئے۔

2001ء میں IBA نے انہیں اجازت دی اور یہ ان کی پالیسی کا حصّہ تھا کہ وہ

اپنے اساتذہ کو پی ایچ ڈی کے لیے کم کلاسز دیتے تھے۔ اس کے ساتھ HEC انہی دنوں نیا نیا قائم ہوا تھا اور HEC نے بھی اسی پالیسی کو حصّہ بنایا کہ زیادہ سے زیادہ پی ایچ ڈی فیکلٹی تیار کی جائی۔ اس کے ساتھ IBA میں اس وقت تین پی ایچ ڈی پروفیسرز موجود تھے۔ IBA نے بخوشی انھیں اجازت دے دی جس کے بعد وہ دو کلاسز پڑھاتے اور باقی وقت اور توجہ صرف اور صرف اپنی پی ایچ ڈی پر مرکوز کرتے۔ اس حکمتِ عملی نے انھیں وقت پر اپنا کام مکمل کرنے میں بہت مدد دی۔ یوں تین سال کے عرصہ میں انھوں نے اپنا بہترین کام مکمل کر کے جنرل پرویز مشرف کے ہاتھوں اپنی ڈگری وصول کی۔

ان کی تحقیق کی ماہیّت کا عنصر بیضوی کرپٹو نظام کے عوام الناس کے لیے کلیدی حفاظتی کارکردگی پر مبنی ہے۔ جس مسئلہ کو انھوں نے اجاگر کیا وہ مسئلہ ECC کو ریاضیاتی محددات سے نکال کر عملی طور پر قابلِ استعمال بنانے کا تھا جو ایک کثیر جہتی مسئلہ تھا۔ اس مسئلہ کا حل اطہر محبوب نے پیش کیا اور انکے سپر وائزر، ان کی تحقیق کے متعلق کہتے ہیں

"اطہر نے خاص طور پر ECC کے معیار کو بنیاد بنا کر دہرے لامتناہی میدان GF (2m) کو ہدف بنایا جس سے ایک مخصوص ریاضیاتی ڈھانچہ تشکیل پایا جو ECC کو Hardware اور software دونوں صورتوں میں عملدرآمد کرنے کے قابل بناتا ہے"۔

انہوں نے بہت زیادہ نئے الگورتھم ایجاد کر لیے جن سے ریاضیاتی عملیّت بنی۔ جس کی وجہ سے ECC کو Software میں استعمال کرنا ممکن ہو پایا۔ ان طریقوں سے کچھ نئے نتائج سامنے آئے جس سے بڑے پیمانے پر کارکردگی میں اضافہ ہوا۔ اس کی مدد سے تیز ترین یاداشتوں کی تلاش ممکن ہو پائی ہے۔ اطہر نے ہارڈویئر کے میدان میں عمل درآمدی کے لیے زمان و مکان کی تجارت بندی کرتے ہوئے کئی مختلف قسم کی ڈیجیٹل جسامتوں کو تیار کیا اور ان کا تجزیہ کر کے دیکھا تو اس سے ایک ڈیجیٹل مرحلہ وار ضربوں کا

سلسہ ملا جس سے واحد گھڑی وار مربعی چکر پیدا ہوئے ۔ اس طرح یہ تحقیق سافٹ ویئر اور ہارڈ ویئر دونوں صورتوں کے لیے ECC کی عمل پذیری میں سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔

اس تحقیق کی اہمیت اور افادیت اس لحاظ سے مسلّمہ ہے کہ اس تحقیق سے دفاعی اور سماجی نقطہ نگاہ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اطہر محبوب اپنے مقالہ میں تحریر کرتے ہیں کہ کرپٹوگرافی کی تاریخ کا آغاز چار ہزار سال قبل ہوا ۔ اسکے پیغامات کو صیغہ راز میں رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس ٹیکنالوجی نے ترقی کی ۔انسان نے کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد ٹیلی کمیونیکشن ذرائع کو ملا کر ابلاغ کے میدان میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس طرح سے ابلاغی تحفظ نے انسانی معاشرہ میں اہم کردار پا لیا۔ ان اہم کرداروں میں سے چند اہم کردار ذیل میں دیئے جا رہے ہیں ۔

رازداری :

کوئی بھی پیغام یا خبر کی پیام رسانی صرف مستند پارٹی کے سامنے ظاہر ہو۔

استناد :

جب دو گروہ آپس میں آگہی کا تبادلہ کر رہے ہوں تب ہر بھیجے ہوئے پیغام کا اصل مآخذ پتا ہو۔

دیانت داری :

دو گروہ جب وہ آپس میں ابلاغ کر رہے ہوں تو انھیں اس بات کا یقین ہو کہ ان کے ابلاغ کے دوران ان کے پیغامات محفوظ ہیں اور کوئی دوسرا ان کے پیغامات کو نہیں سن رہا۔

بلا تردید:

کوئی بھی گروہ جو ابلاغ کا تبادلہ کر رہے ہیں وہ کسی بھی مستند پیغام کا تبادلہ بعد میں کسی بھی وقت بلا تردید کر سکیں۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ کرِپٹوگرافی وہ بنیادی ٹیکنالوجی ہے جو کمپیوٹر اور ابلاغ کو اس قابل بناتی ہے جس سے ابلاغ کا نظام محفوظ بن جاتا ہے۔

انجنیئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب بہ طور انجینئر اپنے کام کو مؤثر انداز میں کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ اپنے پی ایچ ڈی کی تحقیق کو بھی اسی طرز پر عملی طور پر نافذ کیا۔ وہ یوں کہ کرِپٹوگرافی جس میں بہت زیادہ ریاضیاتی فارمولوں کا عمل دخل ہوتا ہے، اس کا استعمال کمپیوٹرز اور اینڈرائڈ فونز پر عملی طور پر کیا جائے تا کہ معلومات کو صیغہ راز میں رکھا جا سکے۔ کرِپٹوگرافی میں دو طرح کے الگورتھم استعمال کئے جاتے ہیں۔ پہلی قسم میں تبدیلی یا متبادل کے طور پر استعمال ہونے والے ریاضیاتی فارمولے ہوتے ہیں جو ایک نمونہ کو دوسرے نمونہ سے یا ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے لے کر دوبارہ تشکیل یا ترتیب کا کام کرتے ہیں اور یہ کام وہ بار بار کرتے ہیں اس کی مثال واٹس ایپ سے دی جا سکتی ہے جس میں پیغام کی کوڈنگ اور ڈی کوڈنگ ریاضیاتی فارمولوں پر خفیہ کاری کے انداز میں کی جاتی ہے اور پیام ایک دوسرے کو پہنچایا جاتا ہے۔

اطہر محبوب نے اس سے جدید مہارتوں کی تحقیق کی جو انتہائی مشکل ریاضیاتی مسائل پر مبنی ہوتی ہے جسکی مثال کرِپٹو کرنسی سے دی جا سکتی ہے جہاں ایسے ریاضیاتی آپریشنز کو سرانجام دیا جاتا ہے جن سے خفیہ پیغام رسانی ممکن ہو سکے۔ اس کا معکوس عمل انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جیسے آپ دو نمبروں کو ضرب دینا چاہیں تو اس کا ایک سادہ سا طریقہ کار ہے کہ آپ ایک نمبر کے مضروب کو دوسرے نمبر کے نیچے لکھتے ہیں اور پھر جمع کر کے مرحلہ وار ایک حاصل ضرب معلوم کر لیتے ہیں۔ اگر اس حاصلِ ضرب کو معلوم کرنا ہو تو ہمیں فیکٹرائزیشن کرنا پڑتی ہے۔ فیکٹرائزیشن میں کافی وقت خرچ ہوتا ہے جب کہ ضرب کرنا آسان ہے اس طرح کے عمل کو جال دروازے یا Trap Doors کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے جال دروازوں سے بنائے گئے خفیہ کار نظام میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر دو کنجیاں رکھتے ہیں۔ ایک خفیہ کاری کی کنجی اور دوسری

اخفاء کاری کی کنجی۔ اس خفیہ کاری کی کنجی کو user کے حوالہ کیا جاتا ہے جیسے کسی بھی ایپ کو استعمال کرتے وقت اس کا کوڈ استعمال کنندہ کو پتہ ہوتا ہے جو وہ دوسروں کو نمبر کی صورت میں دیتا ہے جس سے ہم دوسروں سے رابطہ کرتے ہیں۔ یہ دریافت گذشتہ پانچ ہزار سالوں میں انسانوں کیلئے ایک بہت بڑی دریافت تھی جس کا آغاز 1970ء کی دہائیوں میں ہوا بعد میں اسے عوامی استعمال کے لیے اکیسویں صدی میں شروع کیا گیا۔ 2001ء میں یہ دریافت ابھی نئی تھی اور اس وقت اس کام کے حوالہ سے کسی نے بھی اتنی مہارت حاصل نہیں کی تھی جسے اطہر محبوب نے اپنی ڈاکٹریٹ کے موضوع کے طور پر چنا اور نہایت مہارت اور کم وقت میں اس موضوع سے انصاف کرتے ہوئے اپنی پی ایچ ڈی مکمل کی۔

اسی کی بنیاد پر دیگر کرِپٹو نظاموں کی داغ بیل ڈالی گئی جب کہ بیضوی کرِپٹو نظام ان نظاموں میں سے ایک ہے جو اس وقت دنیا کے مضبوط ترین، انتہائی قابلِ اعتماد اور بہت زیادہ مفید نظام ہے۔ اسکی افادیت و اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امریکی صدر کی سکیورٹی کے لیے بھی انھی الگورتھم کا استعمال کیا جاتا ہے جو بیضوی کرِپٹوگرافی انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نے اپنے تحقیقی مقالہ میں استعمال کی۔ یوں وہ اس میدان میں جو 1996ء سے 2001ء میں دنیا میں متعارف ہوئی، پاکستان میں اس کے سرخیل تھے۔

اس تحقیق کی کہانی بہت دل چسپ ہے 1970ء میں جس پہلے سویڈش شخص نے اس کرِپٹوگرافی کا آغاز کیا۔ اُس نے جب اپنے پروفیسر سے بات کی کہ وہ اس موضوع پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں اور بیضوی کرِپٹوگرافی کو پبلک کرنے کے لیے کام کی اجازت چاہی تو ان کے سپر وائزر نے اس کی حوصلہ افزائی کی بجائے اُن سے کہا کہ تم بہت نالائق ہو اور اس طرح سے تو کبھی ہو نہیں سکتا۔ اس محقق کو اس کورس میں ایف گریڈ ملا تھا۔ مگر اس سب کے باوجود وہ شخص اس کورس پر کام کرتا رہا اور اپنی ہمت اور کوششوں سے اس نے اسے

ایجاد کر لیا۔ اس پر اس کا تحقیقی شمارہ جب شائع ہوا تو سب حیران ہو گئے کہ واقعی یہ ممکن ہے۔ جب دس سال بعد اس پر مزید کام ہوا تو اسی شخص نے جس نے اس کی ایجاد پر اپنی تحقیق کی تھی تو اس نے کہا تھا کہ Elliptic Curve Cryptography اتنا پیچیدہ ہے کہ کوئی شخص اسے استعمال نہیں کرے گا۔

یوں ایک بات واضح ہوتی ہے کہ انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کا مقالہ اپنی نوعیت اور جدّت میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس مقالہ میں جو الگورتھم تجویز کیا گیا ہے، اسے عام استعمال کی چیزوں اور softwares میں بھی لاگو کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر اس کا استعمال معلومات کو مخفی رکھنے کی خوبی کی وجہ سے دفاع میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔

اطہر محبوب چونکہ ایک انجینئر ہیں لہٰذا انھوں نے ریاضیاتی فارمولوں کو عملی شکل دی اور انسانیت کے لیے ایک ایسا عملی کارنامہ سر انجام دیا جس کی تعریف و توصیف ان کے ہم عصر بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں تعریف ہوتی ہے وہاں حاسد بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ یورپ میں بیٹھے محقق خود کو ہی افلاطون سمجھتے ہیں اور پاکستان جیسے ملک سے وہ ایسی کسی اختراع کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اس میں وہ حق بجانب بھی ہیں کیونکہ ان کے پاس دنیا کے جدید آلات اور لیبارٹریز ہیں اور ہم پاکستانیوں کے پاس خالص جذبے، کام سے لگن اور قوّتِ ایمانی ہے۔ وہ اطہر محبوب کے کام کو جھٹلا تو نہیں سکتے تھے مگر چہ مگوئیاں ضرور کیں کہ پاکستان میں ایسا محقق کہاں سے نکل آیا۔ ڈاکٹر اطہر کا یہ تحقیقی کام دو طرفہ تھا جس میں ایک طرف تو ریاضیاتی فارمولے تھے جو اطلاقی نہیں ہوتے۔ دوسری طرف یہ مقالہ ایک انجینئر کا تھا جس کا کام نظر آنا ضروری تھا۔ اس حوالہ سے اس مقالہ کی اہمیت دو دھاری تلوار کی طرح بنتی ہے جس کو ریاضی دان اپنے نقطہ نظر سے جانچتا ہے تو ایک انجینئر اس سے عملی مدد حاصل کر سکتا ہے۔

تحقیق میں تنقید کسی بھی کام کی خوب صورتی اور اس کے استناد کے لیے انتہائی اہمیّت کی حامل ہے۔ انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کی تحقیق پر ریاضی دان تنقید بھی کرتے مگر اس

کے ساتھ ہی وہ اس حوالہ سے توصیف کرتے کہ اس کام کا عملی پہلو انتہائی اہم اور قابلِ عمل ہے جس کی وجہ سے ان کے کام کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر انتہائی پذیرائی حاصل ہوئی۔ وہ بین الاقوامی محققین کے حلقوں میں اپنا ممتاز مقام حاصل کرتے گئے۔ وہ جب بین الاقوامی کانفرنسوں میں جاتے تو لوگ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ پاتے۔ خاص طور پر کوریا اور جرمنی جیسے ممالک کے محققین انہیں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ان کی تحقیق کا سکّہ ان ممالک کے محققین کے ذہنوں پر ثبت ہو چکا ہے۔

کرِپٹوگرافی عسکری اور سفارتی امور کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔پوری دنیا میں کرِپٹو گرافی کا بڑا استعمال دفاعی نقطہ نگاہ سے ہوتا ہے۔ چاہے وہ افواجِ پاکستان ہوں یا امریکہ ،برطانیہ کی افواج ہوں ہر میدان میں ہی اطلاعات کا صیغہ راز میں ہونا اشد ضروری ہے۔ دنیا بھر کی افواج میں جو نظام رائج تھے انہیں روایتی کرِپٹوگرافی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ان کے کتابچے موجود ہوتے ہیں جنہیں Substitution Transition کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ انہیں صدیوں کے نام سے بھی لکھا جاتا ہے جیسے پندرہویں صدی، سولہویں صدی، سترہویں صدی، اٹھارہویں صدی وغیرہ وغیرہ کے الگورتھم لیکن کمپیوٹر کی ایجاد اور خاص طور پر 1980ء کے بعد سے اس کا استعمال عوام النّاس کے لیے بھی شروع کر دیا گیا۔ انٹرنیٹ پر جتنے بھی پروٹوکولز اسی مہارت کے ذریعہ یا اسی کا استعمال کر کے بنائے جاتے ہیں۔ یوں ایک ممنوعہ موضوع ،تعلیمی اداروں میں پڑھایا جانے لگا۔تعلیمی محققین نے اس کا استعمال عمومی انداز میں شروع کر دیا۔انہوں نے اپنے الگورتھم دینا بھی شروع کر دیئے۔ اس سے قبل اس مضمون کو چھپا کر رکھا جاتا تھا تاکہ اس کی رسائی عوام الناس تک نہ ہو پائے۔ یونیورسٹیوں میں اس مضمون کو پڑھایا نہیں جاتا تھا اور کہا یہ جاتا تھا کہ جس نے پڑھنا ہے وہ عسکری اداروں میں جا کر اسکی تعلیم حاصل کرے یونیورسٹیوں تک اس مضمون کی مہارتیں منتقل نہیں کی گئی تھیں حالانکہ یہ ریاضی کی ہی ایک شاخ ہے۔ بہر کیف گذشتہ چند دہائیوں سے یہ اپنے طور پر دیگر مضامین کی طرح ایک اہم مضمون بن چکا

ہے۔

تحقیق کا یہ ماڈل بنیادی طور پر اہمیّت کا حامل ہے جہاں پر ماہر نگران اور تحقیق کرنے والا دونوں ہی تحقیق کے میدان میں برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ اس ماڈل کی تقلید پاکستان میں کی جانا اشد ضروری ہے۔ پاکستان میں تحقیق کرنے والا اپنے نگران کے مرہونِ منت ہوتا ہے اور یہاں ایسی مثالیں واضح ہو چکی ہیں جہاں پی ایچ ڈی اور ایم ایس کے حوالہ سے محقق کو کئی صعوبتیں برداشت کرنے اور عزت نفس قربان کرنے کے بعد گھسیٹ گھسیٹ کر ڈگری دینے کا رواج عام ہے۔ڈگری کے اختتام پر علمی سطح تو بلند ہونے سے رہی،اس کے برعکس اخلاقی و تہذیبی گراوٹ کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ پاکستان میں تحقیق اور محقق ابھی ابتدائی مراحل پر ہیں۔انھیں تکمیل کے مراحل سے گذرنے کے لیے وقت درکار ہے۔ فی زمانہ تو اقوامِ عالم کا ایک دباؤ ہے جس کے تحت پاکستان میں تحقیق کو تیزی سے کیا جارہا ہے تاکہ ہم دنیا کے ساتھ برابری کرسکیں۔ تاہم ہمیں دنیا کے ساتھ مل کر چلنے کے لیے ایک عزم، حوصلہ اور ایک اچھا علمی و تحقیقی معیار چاہیے تاکہ ہم دنیا کے ساتھ مقابلہ بھی کرسکیں۔

پاکستانی معاشرہ زیادہ تر تفریح کی طرف مائل ہے ۔ جو لوگ اس معاشرہ میں تعلیم کا رجحان رکھتے ہیں ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے یا انہیں دیگر طعن و تشنیع کا شکار کیا جاتا ہے ۔ایسا جان بوجھ کر کیا جاتا ہے کیونکہ معاشرہ میں ایسا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے کہ تعلیم کو شعور و آگہی کے بجائے محض نوکری کا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے۔ کھیل تماشے اور سطحی چیزوں پر زیادہ توجہ ہے۔ شادیوں کی تقاریب میں کئی کئی دن صرف کیے جاتے ہیں ۔ قیمتی وقت کے ضیاع کا کسی کو احساس نہیں۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک اپنے لمحے لمحے کا حساب رکھتے ہیں۔ وہ فضولیات کی طرف رغبت کے بجائے اپنے وقت کو تحقیق و حصول علم میں صرف کرتے ہیں۔

پاکستانی طالبِ علم، علم کو شوق کی بجائے مجبوری سمجھ کر حاصل کرتا ہے۔ اِس کی

بنیادی وجہ انتخاب میں آزادی کا حق نہ ملنا ہے۔ یہاں بیشتر نوجوان والدین کی خواہشات کے تحت مجبور ہو کر اُن کی پسند کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ قومی سوچ اور نظریہ میں ایک بھیڑ چال سی نظر آتی ہے، ہر شخص دوسرے کی اندھی تقلید میں لگا ہوا ہے۔ اگر کوئی ایک مضمون جیسے کمپیوٹر کو لے لیں جب نیا آیا تو سب نوجوان اسی مضمون کے پیچھے لگ گئے۔ یہ دیکھے بغیر کہ مارکیٹ میں اس کی ڈیمانڈ کتنی ہے سب اس کی طلب کرتے رہے۔ اسی سوچ کا فقدان اقوام کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ جن اقوام نے ترقی کی منازل طے کیں اور اوجِ کمال حاصل کیا ان کا وطیرہ صرف اور صرف Research Culture کو ترویج دینا رہا ہے۔ ایسے معاشرے میں جہاں تحقیق کو نظر انداز کر دیا جائے وہاں پر تعلیمی انحطاط جنم لیتا ہے اور ایک ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے جسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

پھر وقت کی پُرکار میں لرزش کے ہیں آثار
ذہنوں کی کوئی قوس بھی محور میں نہیں

(احسان رانا)

کہ جس سبب پورا سماجی و معاشرتی نظام نمو نہیں پاتا اور ایک انتشار کی سی کیفیّت پائی جاتی ہے۔ ترقی یافتہ معاشرے اپنے تعلیم و تحقیق کے معیارات کو جدّت پسندی اور ایجادات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سارے عمل کو اس حد تک بہتر اور مربوط بناتے ہیں کہ ان کی تحقیقی و تعلیمی ماحصل تجارتی بن چکی ہے۔ وہ اپنی دانشوارانہ املاک کو مالیاتی جزو کے ساتھ جوڑتے ہیں جس سے ان کے دانشوروں کو معاشی فوائد حاصل ہوتے ہیں جس سے ایک خودکار نظام تشکیل پاتا ہے جو معاشرہ میں بڑھوتری کا باعث بنتا ہے۔ یوں ایسے معاشرے اپنی نمو کو تیز کر کے ترقی کی منازل کو جلد طے کر لیتے ہیں۔ ایسے معاشرے خود کو آئینِ نو میں ڈھال کر تبدیلی کی ہموار راہ اپناتے ہوئے منزل تک جا پہنچتے ہیں۔ ان معاشروں میں ایک ہی اصول کارفرما ہے اور وہ بہت ہی سیدھا اور سادہ اصول ہے تعلیم اور اقدار کی اہمیت۔ ایسے معاشرہ میں تعلیم کا مقصد اس بات پر مرکوز ہوتا ہے کہ آپ کون ہیں اس سے غرض نہیں بل

کہ اس سے غرض ہے کہ آپ کیا جانتے ہیں جبکہ ایسے معاشرے جہاں تعلیم کا مقصد و مطمع نظر یہ ہو کہ آپ کا حوالہ ہے تو ہم آپکو جانتے ہیں اور آپ کا علم مستند ہے ورنہ آپ جو جانتے ہیں اس کی کوئی قدر نہیں گویا سفارش ،ذاتی پسند و ناپسند ایسے معاشروں کا معیار ہے۔ کسی کا ہنر، علم، ذہانت، مہارت اور تجربہ و تحقیق کوئی معانی نہیں رکھتے ۔معیارِ علم جب فہم و فراست کے حصول کے بجائے کاغذی ڈگریوں تک محدود ہو جائے تو تعلیمی ادارے محقق نہیں ذہنی غلام پیدا کیا کرتے ہیں ۔

پاکستان میں پی ایچ ڈی کی تحقیق میں نظم و نسق کے حوالہ سے زیادہ مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب پاکستان میں پی ایچ ڈی کرنے والے کو تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ انہیں عزت و فضیلت دی جاتی تھی ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پی ایچ ڈی کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ خصوصاً پاکستان میں پی ایچ ڈی کرانے والے اداروں میں یہ چرچا ہوتا تھا کہ پی ایچ ڈی تو بس باہر سے ہی کی جائے۔ پاکستان میں کی جانے والی پی ایچ ڈی کی ڈگری تسلیم شدہ نہیں ۔مزید یہ کہ اس کی کوئی اہمیّت نہیں۔ یہ تاثر آج بھی قائم ہے ۔اس حوالہ سے انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب بارش کا وہ پہلا قطرہ ہیں جنھوں نے تمام تر سہولیات کی دست یابی کے باوجود بھی امریکہ کی یونی ورسٹی چھوڑ کر اپنے ملک سے پی ایچ ڈی کی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان میں کی جانے والی پی ایچ ڈی کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی امریکہ سے کی جانے والی پی ایچ ڈی کی۔ دراصل ایک محقق کی اصل پہچان اس کے مخصوص میدانِ کار میں اپنی تحقیق پر عبور حاصل کرنا اور اپنی اہلیت کو اپنے مقالہ کی اہمیت کے ساتھ ثابت کرنا ہے۔ یہی اس محقق کی اصل پہچان ہے کہ اس نے جو تحقیق کی اس میں اس کی مہارت کتنی ہے ۔ وہ کس حد تک اپنے مضمون پر گرفت رکھتا ہے۔ اس کا کوئی آفاقی معیار قطعی نہیں ہوتا اس کی پہچان اس کا متعلقہ دائرہ تحقیق یا موضوعِ تحقیق ہوتا ہے جس میں اس نے ملکہ حاصل کیا ہوتا ہے۔ پی ایچ ڈی ایک انتہائی مخصوص و محدود دائرہ میں ہوتی ہے اگر آپ کے ریسرچ پیپر اور دیگر اشاعتی مواد اسی موضوع پر

دوسرے محقق مان جاتے ہیں کہ ٹھیک ہے تو یہی ایک محقق کی کامیابی ہے نہ کہ اس کے لیے آپ کو پوری دنیا سے کسی سند کی ضرورت ہے۔ بقول ڈاکٹر اقبال:

تو راہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

کسی بھی محقق کیلئے اس کی تحقیق بہت اہمیت رکھتی ہے جب تحقیقی مقالہ کے دفاع کا مرحلہ ہو تو وہ دن بھی انتہائی اہمیّت کا حامل ہوا کرتا ہے کیوں کہ اس دن محقق اپنی تحقیق کے اختتام کی طرف بڑھتا ہے۔اطہر محبوب اور NUST کے لیے یہ موقع انتہائی اہمیّت کا حامل تھا کیونکہ وہ NUST کے پہلے پی ایچ ڈی سکالر تھے ۔وہ ادارہ انتہائی چھان پھٹک کر کے ڈگری ایوارڈ کرتا ہے۔ اس حوالہ سے تحقیقی مقالہ کے دفاع کی تاریخ سے ایک ماہ قبل Pre Viva کا انعقاد کیا گیا جس میں اطہر محبوب کو ایک خصوصی ملاقات کرنے کے لیے اس وقت کے چیف آف نیول سٹاف شاہد کریم اللہ(جو بعد میں سعودی عرب میں سفیر بھی رہے) سے بالمشافہ ملاقات کرائی گئی۔ اس ملاقات کا اہتمام گن روم میں کیا گیا جو پہاڑی پر ایک انتہائی شان دار دفتر ہے جہاں جانا اور بیٹھنا ایک اعزاز سے کم نہیں کیوں کہ وہاں صرف وی وی آئی پی افراد جا سکتے ہیں۔ یہ بالمشافہ ملاقات آدھا گھنٹا جاری رہی جس میں جناب اطہر محبوب سے خاندانی پسِ منظر، تحقیقی کام کی اصلیّت و استناد سے لیکر ان کی ذاتی زندگی کے متعلق گفتگو کی گئی۔

یہ ملاقات اس لئے کی گئی کہ اس وقت NUST کے ریکٹر جنرل شجاعت چاہتے تھے کہ مقالہ کے دفاع سے قبل کلیئرنس کی جائے کہ کہیں کسی کمزور مقالہ پر تو ڈگری نہیں دی جارہی۔اس لئے انھوں نے چیف آف نیول سٹاف شاہد کریم اللہ کو یہ فریضہ سونپا کہ وہ تمام تر رسمی کاروائی پوری کرنے کے بعد Defence کی اجازت دیں۔ اس کا مقصد واضح تھا کہ نیوی نہیں چاہتی تھی کہ بحری فوج کا نام خراب ہو۔ اسی لیے وہ بار بار اپنے سسٹم میں سے گزار کر ڈگری ایوارڈ کرنا چاہتے تھے۔

بہر حال یہ اعزاز کسی نیول آفیسر کو بھی بہت ہی کم ملتا ہے کہ وہ اپنے سارے کیریئر میں چیف آف نیول سٹاف کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کرے لیکن یہ اعزاز بہ طور سویلین اطہر محبوب کے حصّہ میں آیا کہ وہ براہِ راست چیف آف نیول سٹاف شاہد کریم اللہ سے ملے۔ حالاں کہ چیف آف نیول سٹاف کا یہ کام نہیں ہوتا مگر جنرل شجاعت کے حکم پر دو دفعہ پڑتال کی گئی کہ کہیں کسی غلطی کا احتمال نہ رہے اور جگ ہنسائی نہ ہو۔ ان کی یہ ملاقات انتہائی دوستانہ ماحول میں ہوئی اور یہ اطہر محبوب کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا کہ انہیں اس طرح پذیرائی ملی تھی۔ یہی اللہ سبحان وتعالی کی شان ہے جسے سورۃ آل عمران میں بیان کیا گیا، وتعز من تشاء۔

اطہر محبوب جس دن اپنے تحقیقی مقالہ کے دفاع کے لیے NUST اسلام آباد سے آئی پی این ایس جوہر کراچی پہنچے تو وہ جانتے تھے کہ ان کو آج ان کی محنت کے ثمرات ملنے والے ہیں۔ پانچ گھنٹوں پر مبنی اس طویل تحقیقی مقالہ کے دفاع اور وہاں موجود ماہرین کے تنقیدی سوالات کسی بھی سکالر کے پاؤں تلے زمین کو متزلزل کر دیتے ہیں اور کئی اپنی ہی تحقیق کو بہ احسن طریق بیان نہیں کر پاتے۔ بہر کیف یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جب ایک محقق اپنے کام کو ماہرین کے سامنے پیش کرتا ہے اور اطہر محبوب نے مسلسل پانچ گھنٹوں تک اپنی تحقیق کی جزیات کی اہمیّت کو انتہائی پرسکون اور ماہرانہ انداز میں بیان کیا جس کا آغاز صبح 9:30 بجے سے لیکر دو پہر ڈیڑھ بجے تک جاری رہا۔ ہر مرحلہ پر ماہرین کو مطمئن کر کے داد حاصل کرتے رہے۔ ایک وقت آیا جب ماہرین کی ٹیم کو کہنا پڑا کہ یہ ایک نہایت اہم کام ہے اور وہ اس کام کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اپنے تحقیقی مقالہ کا دفاع ایک نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہوا کرتا ہے اگر چہ محقق تمام کام بمعہ نشر واشاعت اندریں بین الاقوامی تحقیقی رسالہ جات کر چکا ہوتا ہے اور دفاع محض ایک رسمی کاروائی ہوا کرتی ہے کیوں کہ اس مقالہ کی تشخیص و دیگر مراحل بین الاقوامی ماہرین کر چکے ہوتے ہیں مگر بہر حال محقق پر ایک رسمی دباؤ ہوا کرتا ہے جس سے نبرد آزما ہونا

جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس میں محقق کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور ابلاغی صلاحیت اس کی تحقیق کو چار چاند لگا دیتے ہیں اگر یہ خصوصیات محقق میں نہ ہوں تو ساری تحقیق بے ثمر ہو جایا کرتی ہے۔ اکثر محقق ابلاغ میں مار کھا جاتے ہیں۔ اپنے کئے ہوئے کام کو بیان نہیں کر پاتے۔ ممتحن اور عوام الناس نے اطہر محبوب کی تحقیق کو منظوری کا درجہ دیا اور یوں جناب اطہر محبوب، ڈاکٹر اطہر محبوب بن گئے۔ اس کے بعد جو سنگِ میل عبور ہوا وہ اس کے چھ ماہ بعد Convocation میں اعزاز کی صورت میں ملا، جو شاید اگر وہ MIT یا جورجیا ٹیک امریکہ سے ڈگری حاصل کرتے تب بھی نہ مل پاتا اور یہ اعزاز تھا اپنی ڈگری کو مملکتِ خدادادِ پاکستان کے ریاستی سربراہ سے ملنا۔

انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کو ان کی محنتوں کا صِلہ بھرپور اعزاز کے ساتھ دیا گیا۔ انہیں اپنی پی ایچ ڈی کی اصل ڈگری اس وقت کے صدرِ پاکستان جنرل پرویز مشرف نے عطا کی۔ اس تقریب کا انعقاد کنونشنل سنٹر اسلام آباد میں کیا گیا تھا۔

2005ء میں NUST کے سربراہ جنرل شجاعت تھے۔ تین NUST سے پاس شدہ ڈاکٹرز کو اصلی سندات دلوائی گئیں جن میں انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب بھی شامل تھے۔ ان کے ریکٹر جنرل شجاعت نے ان کے کام کے متعلق جب مختصراً بتایا تو جنرل پرویز مشرف نے کہا کہ،

"Athar, we are really proud of you."

یہی وہ حاصل ہوتا ہے جو آپ اپنی محنت کے ثمر کے عوض پا لیتے ہیں۔ یہ والدین کی دعاؤں کا نتیجہ تھا جو اطہر محبوب کو اس ڈگری کی صورت میں ملا۔ اُنہیں یہ احساس دلایا گیا کہ دیکھئے آپ کا ملک آپ پر کتنا فخر کرتا ہے۔ شاید یہ اعزاز بیرونِ ملک ڈگری کی صورت میں وہ حاصل نہ کر پاتے جو اعزاز انہیں اپنے ملک میں ملا۔

اپنے تحقیقی مقالہ کے دفاع کے بعد انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کے اعزاز میں اسی گن روم میں دوبارہ ایک بہت بڑی اعزازی تقریب منعقد کی گئی جس میں نیوی کے

ایڈمرلز مدعو تھے۔ ایسا ماحول بنا ہوا تھا جیسے نیوی کو کوئی نئی سب میرین ملی ہو یا نیوی نے جیسے کوئی نیا جہاز بنایا ہو۔ اس شان دار تقریب کے اہتمام کی وجہ NUST کے پہلے پی ایچ ڈی کا استقبال تھا۔ تمام ایڈمرلز یکے بعد دیگرے سٹیج پر آتے اور انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کے حوالے سے تعریفی و توصیفی جملے ادا کرتے۔ اس موقع کی مناسبت سے انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کو ایک شیلڈ سے بھی نوازا گیا۔ اس کے بعد 2001ء سے لے کر آج تک NUST اور نیوی کے ہر پراسپیکٹس میں انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کا نام بہ طور خاص لکھا جاتا ہے اور یہی نہیں بلکہ ان کی جو بھی تصنیف یا بروشر اٹھائیں وہاں یہ درج ہے کہ انکا پہلا پی ایچ ڈی انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب ہے۔ اس طرح سے انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نیوی کی تاریخ کا لازم و ملزوم جزو بن چکے ہیں۔

بحوالہ (https://pk.linkedin.com/in/athar-mahboob-1105a984)

انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب NUST کا فخر بن چکے ہیں۔ یہ عزت قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ پی ایچ ڈی کے حوالہ سے انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب اپنے تحقیقی کام سے انتہائی مطمئن تھے۔ انھوں نے اپنی بھرپور صلاحیتوں کو اپنے تحقیقی مقالہ کی صورت میں کامیابی سے تحریر کیا جو ایک محقق کے اطمینان کے لیے ضروری تھا۔ اس میں انھوں نے ہر بہترین پلیٹ فارم استعمال کیا جس سے ان کی تحقیق اجاگر ہو سکے۔ ہر ممکن کوشش کی کہ جتنا معیار وہ اپنی تحقیق میں لا سکتے ہیں وہ لے آئیں۔ انھوں نے تحقیق میں معیار حاصل کرنے کیلئے ہر ممکنہ تحقیقی استناد حاصل کیں کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ تحقیق ایک تربیت کا نام ہے جس میں محقق، تحقیق کرنے کے طریقے سے روشناس ہوتا ہے یا ایک عادت پڑتی ہے کہ وہ ہر بات میں، ہر کام میں تحقیقی ذرائع کو استعمال کرنا سیکھتا ہے۔ پی ایچ ڈی کا سرٹیفکیٹ اس بات کا غماز ہوتا ہے کہ یہ شخص تحقیق کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہے اور مزید تخلیق و تحقیق کے ابواب کھول سکتا ہے۔

باب گیارہ

رہبر، ہمدم وغم خوار، استاد ہیں قوم کے معمار

استاد معمارِ قوم ہیں اور آج کی ترقی یافتہ اقوام کی ترقی اور شان وشوکت اساتذہ کے مرہونِ منت ہے۔ استاد نسلوں کا نگہبان ہوتا ہے۔ کتاب صرف معلومات کی فراہمی کا ایک ذریعہ ہے مگر یہ استاد کی ذات ہے جو تعلیم دیتی ہے۔ تعلیم صرف نصاب رٹا دینے کا نام نہیں بلکہ یہ تعلیم وتربیت ہے اور تزکیہ بھی، استاد اپنی روح اپنے شاگردوں میں پھونک دیتا ہے، وہ اخلاق وکردار کی عظمت کا چلتا پھرتا پیکر ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر تقدس جاگتا اور احترام خود بہ خود ابھرتا ہے۔ اس کا عمل اس کے علم کا آئینہ ہوتا اور اس کی روشنی میں وہ شاگردوں کے اخلاق سنوارتا اور کردار نکھارتا ہے۔ استاد کی ہر بات، ہر عمل اس کے علم کا آئینہ ہوتا ہے۔ ایک باعمل استاد کی ہر بات ہر عمل اور ہر نصیحت قابلِ تقلید نمونہ ہوتی ہے۔ یہی وہ عظمت ہے جس کے سامنے تخت وتاج بھی جھکتے ہیں یہ اسی کا فیض ہے کہ وہ حیوان کو انسان اور انسان کو باکردار انسان بنا دیتا ہے۔ از روئے حدیث ﷺ استاد کی حیثیت روحانی باپ کی سی ہے۔ اس کا حق اپنے شاگردوں پر اتنا ہی ہے جتنا کہ باپ کا اولاد پر۔ ایک اور ارشادِ رسالت ﷺ ہے کہ استاد کا احترام تعظیم خداوندی میں داخل ہے۔ ہر عظیم انسان کے دل میں اپنے استاد کے لیے احترام کے بے پایاں جذبات ہوتے ہیں۔ یہی اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

یونیورسٹی کسی قوم کو جانچنے کا معیار ہوا کرتی ہے کہ یہاں پر قوم کے ذہین افراد

اپنی قوم کے ذہن کی تعمیر اور مستقبل کے لیے نوجوان نسل کو تیار کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے ملک و قوم کے حال میں درپیش مصائب و مشکلات سے نبرد آزما ہو سکے۔ یہاں ادب کی پرورش اور تہذیب کی بوقلمونی ہوتی ہے۔ یہاں علم کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ آگہی کی خوش بو چہار سو گلستان کو مہکاتی ہے۔ یونیورسٹیاں علمی و تحقیقی روایات کی امین ہوتی ہیں جہاں سے تہذیب و تمدن نمو پاتی ہے۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے یونیورسٹیاں اپنے ملک وقوم کی پہچان کا ذریعہ بنتی ہیں۔ یونیورسٹی تو اینٹوں سے بنا ہوا ایک ڈھانچہ ہے صرف ایک عمارت اور اس عمارت کو عظیم درس گاہ کی پہچان دینے والوں میں اساتذہ اور طالبِ علم ہوتے ہیں جو اینٹ، مٹی اور گارے سے بنی اس عمارت میں روح پھونک کر اسے زندہ و جاوداں بنا دیتے ہیں۔ تعلیمی ادارے بالعموم اور یونی ورسٹی بالخصوص کسی بھی قوم کی میراث ہوتی ہے جو نسلوں کی آبیاری کرتی ہے اور علوم وفنون کی قلمیں یہی پھل پھول کر تناور درخت بنتی ہیں۔

استاد اور شاگرد کا تعلق علم کی بنیاد پر ہوتا ہے شاگرد اپنے علوم کو استاد سے لیتا ہے گویا استاد ایک دریا ہے جس میں علم کا پانی ٹھاٹھیں مارتا ہے اور شاگرد اس دریا میں غوطے لگا کر اس کی گہرائی میں جا کر علم کے موتی ہیرے اور جواہرات نکال کر اپنے دامن میں بھرتا ہے۔

ہم خوش قسمت ہیں کہ آج بھی ہمارے ہاں نظریاتی استاد موجود ہیں۔ جو مادی چکاچوند کو بے معنی سمجھتے ہیں اور اپنے پیشے کو عبادت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی تدریس کا مقصد حصول زر نہیں بلکہ خدمت ہوتا ہے۔ انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کے متعلق ان کے شاگردوں کی یہ رائے ہے کہ وہ ایک عملی استاد ہیں۔ انھوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ مفروضوں پر بات نہیں کرتے بلکہ ہر موضوع کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اسی عمل کے لیے انہوں نے اپنے طلباء کو علمی ماحول دینے اور ان کی کاوشوں کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کیلئے ایک کمپنی بنائی جس کا نام ابنِ خلدون سسٹمز تھا۔ اس کمپنی کا بنیادی مقصد طلباء کی عملی طرز پر تربیّت اور انکی بیرونی دنیا سے روشناس کرانا تھا تاکہ وہ تھیوری کے ساتھ ساتھ

پریکٹیکل کر کے مارکیٹ کے لیے تیار ہو۔ جو بھی غلطی کرنا ہے وہ ان کے نظروں سامنے کر لیں تا کہ جب مارکیٹ میں جائیں تو اپنے کام میں یکتائے روزگار ہوں۔ کام میں لگن اور اپنے پیشہ سے دیانت داری ہمیشہ انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نے ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھی۔ انھوں نے پیشہ ورانہ مصروفیات کو اہمیّت دی اور اسے اپنی پہلی ترجیح رکھا۔ خواہ وہ کسی کاروبار میں مصروف رہے، اپنے کنبہ کے ساتھ رہے یا اپنی تعلیمی سرگرمیاں سرانجام دیتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کے ساتھ رابطہ میں کسی قسم کی مصروفیّت کو حائل نہیں ہونے دیا۔

وہ بطور استاد قابلِ تقلید ہیں اور انکے رفقائے کار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اطہر محبوب چار لوگوں جتنا کام کرتے تھے اور کام ہی ان کی زندگی کا محور و مقصد ہے۔ کام انہیں خوشی دیتا ہے۔کام کی تکمیل ان کے اطمینان کا باعث بنتی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں! کہ ہم نے کبھی اطہر محبوب کو تھکے ہوئے نہیں پایا۔ یہ ان کا مزاج ہے کہ وہ خود کو مصروف با عمل رکھتے ہیں اور وہ ہمیشہ سرگرم رہنے والے شخص ہیں۔

ان کے متعلق یہ رائے کسی ایک ادارہ کی نہیں ہے بلکہ ان پانچ اداروں سی لی گئی رائے پر مبنی ہے جہاں انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی بطور استاد، ڈین شعبہ، تحقیق دان، پرو وائس چانسلر اور وائس چانسلر کے نبھائے۔ ان کے Work Alcoholic ہونے پر سبھی رفقائے کار متفق ہیں۔

ان کے اس جذبہ کے پیچھے کون سے عوامل رہے جب اس پر تحقیق کی تو چند اہم باتیں سامنے آئیں جن کا اجمالی جائزہ پیشِ خدمت ہے۔ جس وقت انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب پاکستان آئے تو ان پر امریکہ کی تعلیم اور وہاں کے ماحول کے اثرات تھے جہاں پر زندگی بہت تیز اور کام کو لگن اور مگن سے کرنے کی عادت وہ اپنی تربیت میں شامل کر کے آئے تھے اور جب سرزمینِ پاکستان پر قدم رکھا تو 1996ء میں پاکستان میں ایسا ماحول نہیں پایا۔ ان میں اپنی قوم سے متعلق سوچنے اور ان کو بہتر کرنے کا جذبہ مہمیز ہوا۔

انھوں نے کراچی کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس وقت کراچی میں سیاسی حالات انتہائی دگرگوں تھے مگر اس دور میں سندھ کے گورنر حکیم محمد سعید (19 جولائی 1993ء سے 23 جنوری 1994ء) نے سندھ ہائیر ایجوکیشن میں کئی مثبت تبدیلیاں کیں جن سے سندھ میں ہائیر ایجوکیشن کی کارکردگی میں بہتری آئی۔ انھوں نے نہ صرف سرکاری یونیورسٹیوں کو بہتر اور پرائیویٹ یونی ورسٹیوں کو چارٹرڈ کیا۔ اُن میں بقائی یونیورسٹی، سرسیّد یونیورسٹی، ضیاء الدین میڈیکل یونیورسٹی اور ہمدرد یونیورسٹی شامل ہیں۔ حکیم سعید نے اس دور میں سندھ ہائیر ایجوکیشن میں ایک تغیّر لانے کی کوشش کی۔ تبدیلی کی اس لہر کا آغاز 1994ء سے ہوا اور اس کی لہریں انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کے 1996ء میں آنے تک تبدیلی کے یہ موثر اثرات نتیجہ خیز ہو چکے تھے۔ ان کوششوں نے ڈاکٹر اطہر کو بہت متاثر کیا۔ اس دور میں کراچی کے لوگ کوشش کر رہے تھے کہ پرائیویٹ سیکٹر کو بہتر بنایا جائے کیوں کہ گورنمنٹ سیکٹر میں تو بہت زیادہ سیاسی عمل دخل اور شکست و ریخت کا سامنا تھا۔ اس دور میں لوگوں کا رجحان اور توانائیاں پرائیویٹ سیکٹر کی طرف زیادہ تھیں۔ انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب بھی اس کوشش میں شامل ہو گئے کہ پرائیویٹ سیکٹر کو بہتر تعلیمی ماحول ملے اور وہاں آنے والے طلباء بہتر انداز میں اپنی تعلیم مکمل کر سکیں۔ انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب اسی جذبہ کے زیر اثر امریکہ کی تمام سہولیات اور پیش کش کو چھوڑ کر آئے تھے کہ اپنے ملک وقوم کی خدمت کریں اور یہاں کے تعلیمی اداروں کو دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں کی صف میں لا کھڑا کریں۔ بطورِ استاد انہوں نے سرسیّد یونیورسٹی سے آغاز کیا۔ وہاں پراجیکٹس حاصل کئے اور کافی زیادہ تعلیمی کام کیا جس سے سرسیّد یونیورسٹی ایک بہتر مقام حاصل کر پائی۔ ان چھ سالوں میں انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نے انفرا سٹرکچر بہتر کیا، ملک و بیرونِ ملک سے عطیات حاصل کئے۔ کئی لیبارٹریز بنائیں جہاں طلباء نئی مہارتیں سیکھتے اور وہ انہیں پنپتا دیکھ کر اپنی کامیابی پر خوش ہوتے۔

ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر یونیورسٹی انتظامیہ اور اس دور کے وائس چانسلر ان کو

کہتے کہ آپ پی ایچ ڈی نہیں لیکن آپ کا کام ان سے دس گنا زیادہ وقیع ہے۔ اسی دوران انہیں اس بات کا شدّت سے احساس ہوا کہ وہ صرف امریکہ سے ماسٹرز کر کے آئے ہیں اور اگر وہ یونیورسٹیز میں اپنی جگہ اکیڈیمیا میں چاہتے ہیں تو انہیں اپنی تعلیم کو جاری رکھنا پڑے گا اور یہی ایک اچھے استاد کی نشانی ہے کہ وہ کبھی بھی کتاب اور تحقیق سے دور نہیں رہتا۔ استاد اس وقت استاد کہلانے کا مستحق ہوتا ہے جب وہ اپنے علم کو Update کرتا رہتا ہے کیونکہ علم کا کوئی اختتام نہیں، شعور و آگہی کی کوئی سرحدیں نہیں یہ عمیق وسیع ہوا کرتا ہے اور خود کو عقلِ کل سمجھنے والوں کی شعوری موت اسی وقت شروع ہو جایا کرتی ہے جب وہ خود کو حرفِ آخر سمجھ لیتا ہے۔ انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نے اپنے علم کو جدید دنیا سے منسلک اور مزید بہتری کیلئے پی ایچ ڈی کا فیصلہ لیا۔ اس فیصلے کے پیچھے ان دنوں کی نئی تعلیمی پالیسیاں بھی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جس میں (HEC) ہائیر ایجوکیشن کمیشن قائم ہو گیا تھا اور پی ایچ ڈیز کی تعداد بڑھانے کے چرچے ملک میں زبان زدِ عام تھے۔

انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نہ صرف ایک اچھے محقق ہیں بل کہ وہ ایک بہترین استاد بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے علم کی منتقلی اپنے شاگردوں اور اپنے زیرِ سایہ محققین تک بہم پہنچائی۔ وہ اب تک تیرہ ایم ایس اور تین پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالہ جات کی تکمیل کرا چکے ہیں۔ ان کا ایک ایم ایس کا محقق اور ایک پی ایچ ڈی کا محقق اپنی تحقیق کو مکمل نہیں کر پائے جو ان محققین کی ذاتی وجوہات کی بنا پر ہوا۔ انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نے حتی المقدور کوشش کی کہ وہ اپنی محنت کو ضائع نہ جانے دیں کیوں کہ وہ ان سپروائزرز میں سے ہیں جو اپنے زیرِ سایہ تحقیق کرنے والوں سے بڑھ کر خود ان کے کام میں انکی مدد کرتے ہیں۔ ان کے پہلے کامیاب پی ایچ ڈی سکالر کا نام ڈاکٹر کاشف لطیف ہے جو اس وقت پاکستان نیوی میں میری ٹائم ٹیکنالوجی کمپلیکس میں کام کرتے ہیں جو ایک قسم کی سٹریٹیجک تنظیم ہے۔ دوسرے پی ایچ ڈی محقق کا نام ڈاکٹر شاہ رخ ہے جو نیوی کے کمپلیکس میں خدمات سر انجام دے رہے ہیں اور تیسرے پی ایچ ڈی محقق کا نام کمانڈر ڈاکٹر اشفاق احمد ملک ہے

و2021ء میں نیوی سے ریٹائر ہوئے ہیں اور اس وقت اسلام آباد میں سکونت پذیر ہیں۔
بہ طور پی ایچ ڈی سپر وائزر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نے ہمیشہ اوسط درجہ کے محققین کو چنا اور اپنی قابلیت اور تن دہی سے ان کے رویوں میں تبدیلی لا کر ان کی استعداد کو بڑھایا۔ وہ اپنے وژن سے اذہان کی تربیت کے قائل ہیں۔ اسی وجہ سے وہ دوسرے سپروائزرز سے مختلف ہیں جو اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ انھیں ایسے اذہان ملیں جو انتہائی قابل ہوں۔ حالاں کہ پاکستان میں یہ ایک عام رواج ہے کہ جو بہت ذہین اور قابل طالبِ علم ہوتا ہے وہ بیرونِ ملک کی راہ لیتا ہے اور جو پیچھے بچ جاتے ہیں انہیں دوسرے سپر وائزرز اپنا لیتے ہیں مگر یہ ملکہ انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کو حاصل ہے کہ وہ خام کو سونا بنانے کا گر جانتے ہیں۔ وہ ایسے کیمیا گر ہیں جو خام ذہنوں کو کمالِ اوج تک پہنچانے کی اہلیّت رکھتے ہیں۔ ان کی یہ اہلیّت ان کے مزاج کی نرمی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے کہ ان سے تحصیلِ علم کے بعد ان کے شاگرد اپنے میدان کے ماہر بن جاتے ہیں اور ایک نئے جذبہ کے ساتھ ملک وقوم کی خدمت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

ان کے شاگرد ان کی صلاحیّتوں کے معترف ہیں وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نے ان کی تعلیمی صلاحیت کو بڑھانے اور ان کے کردار کی تعمیر میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ اس بات سے بہت خوش نظر آتے ہیں کہ دورانِ تحقیق انکے سپروائزر ان سے زیادہ متحرک تھے، تحقیق میں ان سے زیادہ ان کی تحقیق کے متعلق معلومات فراہم کرتے تھے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اطہر محبوب ہماری تحقیق کے لیے دن رات صرف کرتے یہاں تک کہ وہ اپنی چھٹیوں کے دن جو خاص طور پر انکے خاندان کے لئے ہوتے ہیں وہ ان دنوں میں بھی ہمیں بلا کر تحقیق کرواتے۔ یوں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے سپروائزر سے ان کے خاندان کیلئے وقف اوقاتِ کار کا 90%حصّہ لے جاتے اور کام سے اسی لگن اور اپنے طلباء سے بے لوث شفقت نے انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کو ایک کامیاب استاد اور کامیاب انسان بنایا۔ انتہائی پروفیشنل مصروفیات کے باوجود وہ اپنے

ساتھ منسلک محققین کے لئے خصوصی وقت نکالتے اور جو وقت ان کے آرام کا تھا وہ بھی اپنے شاگردوں کو دیتے رہے اور ہمیشہ اُن کو دست یاب رہے۔

ان کے تربیت یافتہ طلبا اچھے عہدوں پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے ۔ان کے شاگرد نہ صرف سویلین محکموں میں ہیں بل کہ افواجِ پاکستان میں بھی کلیدی عہدوں پر فائز ہیں جو کمانڈانٹ کے طور پر ملک وقوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ تو یوں ان کا ملک وقوم کی خدمات کے حوالہ سے حصّہ اندرونِ ملک اور سرحدوں دونوں جگہ پر ہے۔ اس سب کے علاوہ پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کے ذمّہ یہ فریضہ بھی بہ یک وقت رہا ہے کہ وہ نئی یونیورسٹیوں کے قیام ونظم ونسق کے حوالہ سے بھی ملکہ رکھتے ہیں۔

2002ء میں جنرل مشرف کے دورِ حکومت میں ڈی ایچ اے کراچی میں ایک یونیورسٹی کو چارٹر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت وہاں کے کور کمانڈر جنرل عثمانی مرحوم جن کی وفات 2020ء میں سی ویو پر ہوئی۔ ڈی ایچ اے کیوں کہ ایک کور کمانڈر کے ماتحت کام کرتا ہے تو انھوں نے ڈی ایچ اے کو کہا کہ وہ ایک یونیورسٹی بنائیں اور اس یونیورسٹی کا نام اصحاب صفّہ کے نام پر صفّا یونیورسٹی رکھا جائے ۔ ان کے حکم کی تعمیل میں ڈی ایچ اے نے سندھ حکومت سے 2002ء میں اجازت حاصل کر لی مگر جنرل عثمانی کے وہاں سے تبادلہ کے بعد ڈی ایچ اے نے یونیورسٹی کے اس منصوبہ کو مئوخر کر دیا۔ دس سال کے بعد جنرل عثمانی کے ایک شاگرد جنرل ظہیر الاسلام جب 2012ء میں آئے تو جنرل عثمانی نے ان سے شکوہ کیا کہ میں نے ڈی ایچ اے کراچی کو ایک یونیورسٹی کا منصوبہ دیا تھا جو انہوں نے داخلِ دفتر کر دیا جس پر عملدرآمد کروانے کے لیے اپنے انسٹرکٹر کے کہنے پر ڈی ایچ اے کو دوبارہ ٹاسک دیا کہ وہ یونیورسٹی کی تعمیر شروع کریں۔ ان کی حکم کی بجا آوری میں جو ٹیم اسے تعمیر کرنے اور چلانے کے لیے بنائی گئی اس میں پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کو کلیدی رکن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس ادارہ کی تعمیر کے بعد انہیں صفّا یونیورسٹی کا ڈین بھی مقرر کیا گیا۔ 2018ء میں کور کمانڈر نے انہیں بطور وائس چانسلر صفہ یونیورسٹی

منتخب کیا مگر انہوں نے جامعہ اسلامیہ کی وائس چانسلرشپ کو ترجیح دی اور یہاں آ گئے۔ یوں انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ فوج میں انھیں سویلین ہونے کے باوجود ترجیح دی جاتی رہی۔

پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کی زندگی میں ہجرت اور صوبہ سندھ سے صوبہ پنجاب کی طرف منتقلی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہمہ جہت چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور زمان و مکاں کی تبدیلی ان کے لیے کوئی معانی نہیں رکھتے۔ اپنے گھر اپنے آبائی شہر کو خیر باد کہنا اور نئی جگہ آ کر اپنی پہچان بنانا قابل لوگوں کی فطرت ہوتی ہے۔ یہی وہ دھن ہوتی ہے جو سفر کو وسیلہ ظفر بناتی ہے۔

یوں تو امریکہ سے واپسی کے بعد پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نے دو دہائیوں تک کراچی (سندھ) میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور اس کا اعتراف پاکستان نیوی کے اداروں نے بھی کیا مگر ہر ایک انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ آگے بڑھے اور اپنی منزل اور اپنے مقاصد کیلئے اعلیٰ ترین اہداف منتخب کرے۔ پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب طویل عرصہ تک عسکری اداروں میں کام کر چکے تھے اس لیے انھوں نے اب اپنا ہدف پرائیویٹ یونیورسٹیوں سے ہٹ کر سرکاری یونیورسٹیوں کو بنا لیا۔

انتہائی کم عمری میں انہوں نے اپنی محنت اور قابلیّت سے اہم کارہائے مناصب نبھائے جن میں نیول انجینئرنگ کالج کے ڈیٹا بیس، ڈیٹا انٹری سے لے کر وہاں پر موجود آفیسران کی انکوائریز کو نمٹانے اور مختلف نظم ونسق کی کمیٹیوں تک غرض ہر میدان میں کام کیا۔ ان کے ساتھی ور ان کے سینئرز سبھی ان پر بھروسہ کرتے اور کئی مرتبہ ان کی ایمانداری، فرض شناسی اور دیانت داری کی وجہ سے عسکری معاملات میں بھی ان کو بلا کر معاونت اور فیصلہ سازی کے عمل میں ان سے مشاورت کی جاتی تھی۔ ان سب کے باوجود عسکری ادارے اپنے ڈسپلن کی بندشوں کی وجہ سے انہیں ایک ہی مقام پر جمود میں رکھے ہوئے تھے جو اُن جیسے مہم جو، سرگرم شخصیّت کے مزاج اور طبیعت کے برعکس تھا۔

صفا یونیورسٹی میں ساڑھے تین سال عرصہ گذارنے کے بعد وہ اس بات سے بہ

خوبی آگاہ تھے کہ عسکری اداروں میں انہیں مزید ترقی ملنا ممکن نہیں تھی دوسرا یہ سوچ بھی گذرتے وقت کے ساتھ حاوی تھی کہ امریکہ چھوڑنے کے بعد اپنے خاندان کی فکرِ معاش انھی کے ذمہ تھی جو ان محدود وسائل میں پوری کرنا ممکن نہیں تھا۔ اپنی زندگی کی سولہ سال کراچی کے پرائیویٹ سیکٹر میں گذارنے کے بعد وہ پنجاب کے سرکاری اداروں کی طرف مائل ہوئے تاکہ وہ بہتر کام اور معاشی ترقی کی جانب بڑھ سکیں۔ اس سفر میں ان کے والدین نے بھی انکا ساتھ دیا اور ان کے والد نے اپنا کراچی کا گھر کا ان کے نام کر دیا اور خود وہ امریکہ منتقل ہو گئے۔

ڈاکٹر اطہر نے ہمیشہ توکّلت علی اللہ پر بھروسہ کیا اور کبھی نہیں سوچا کہ کل کیا ہو گا۔ نہ ہی یہ فکر دامن گیر رہی کہ ان کی پرائیویٹ سیکٹر میں فرائض کے اختتام پر انھیں کوئی پنشن نہیں ملے گی۔ ان کا اپنے اللہ پر یقینِ کامل ہے کہ انھیں صرف کام کرنا ہے جزا اور اجر، اللہ سبحان و تعالی نے عطا کرنا ہے۔ اسی توکّل اور قلندرانہ وصف نے انھیں رئیس الجامعہ کے مقابلے کیلئے تیّار کیا اور خدا نے انہیں کامیابیوں سے نوازا۔ ایک اور تعلیمی درس گاہ خواجہ فرید یونیورسٹی ،رحیم یار خان کی بنیادیں ان کے ہاتھوں رکھوا دیں۔

اپنے اس خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نے وائس چانسلرشپ کے امیدوار کے طور پر مختلف یونیورسٹیوں کے لیے سرچ کمیٹی کو درخواستیں دیں جس پر عملدرآمد 6 ستمبر 2015ء سے شروع ہوا اور تقریبا چھ ماہ کے عرصہ تک چلا اور 2 ستمبر 2015 کو بطور وائس چانسلر اپنی جوائننگ خواجہ فرید یونیورسٹی دینے کیلئے پہنچے۔ اس حوالہ سے وہ تین بار انٹرویو دینے کے لیے لاہور بلائے گئے۔ پہلے انٹرویو کے مرحلہ میں انھیں 225 درخواستوں میں سے منتخب کیا گیا جن میں سے 150 امیدوار انٹرویو کے اہل قرار پائے۔

دو ماہ بعد ایک اور کال لیٹر موصول ہوا کہ مزید شارٹ لسٹنگ کی گئی ہے۔ دوسرے مرحلہ میں 64 اہل امیدوار باقی بچ گئے ہیں جن کا دوبارہ مقابلہ ہے۔ اگر آپ

چاہیں تو Skype پر بھی یہ انٹرویو کیا جا سکتا ہے مگر سنجیدگی کا تقاضا یہ تھا کہ سرچ کمیٹی کے سامنے پیش ہوکر بالمشافہ انٹرویو دیا جائے۔ اس سرچ کمیٹی کی سربراہی LUMS کے بانی سید بابر علی کر رہے تھے، ان کے ساتھ ڈاکٹر نظام الدّین تھے جو اسوقت پی ایچ ای سی کے سربراہ تھے، ڈاکٹر قریشی تھے جو سابق وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف کے استاد رہے تھے اور سیکرٹری ہائر ایجوکیشن کمیشن شامل تھے۔ دوسرا مرحلہ طے ہوا جس کے بعد انٹرویو کا تیسرا مرحلہ طے آیا جس میں ہر یونیورسٹی کے سامنے تین امیدواروں کی فہرست بنا کر پیش کی گئی۔اس بار انٹرویو وزیرِ اعلیٰ پنجاب شہباز شریف نے خود لیا۔ درخواست پر پہلے ہی یہ آپشن لے لی گئی تھی کہ خواتین کی یونیورسٹیوں کے لیے صرف خواتین امیدواران ہی درخواست دینے کی اہل ہونگی جب کہ مردانہ یونیورسٹیوں کیلئے مرد حضرات ہی درخواست دینے کے اہل ہونگے۔ جب انٹرویو شروع ہوا تو ایسا لگا کہ اطہر محبوب کا انٹرویو خواجہ فرید یونیورسٹی کیلئے ہوگا۔ وزیر اعلیٰ کے انٹرویو کے بعد کئی چہ مگوئیاں ہوئیں کہ انٹرویو منسوخ کئے جا رہے ہیں لیکن بالآخر 28 اگست 2015ء کو نوٹیفیکیشن آگیا کہ پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کو وائس چانسلر خواجہ فرید یونیورسٹی منتخب کر لیا گیا ہے۔ اس تمام عرصہ میں تین دفعہ انٹرویو دینے کے لیے پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب تین بار جہاز کے ذریعہ لاہور آچکے تھے اور اس پر معقول رقم خرچ کر چکے تھے۔ نوٹیفیکیشن کے ساتھ ہی یہ پیغام ملا کہ نئے منتخب شدہ وائس چانسلرز کی ایک مشترکہ میٹنگ پی ایچ ای سی لاہور میں منعقد ہو رہی ہے جس کی صدارت وزیرِ تعلیم رانا مشہود حسین کریں گے۔ پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نے فون کر کے پی ایچ ای سی چیئرمین کے دفتر سے پوچھا کہ اب تو میں منتخب وائس چانسلر ہوں اب کی دفعہ تو ائیر ٹکٹ دے دیں۔ جس پر جواب ملا کہ ڈاکٹر اطہر محبوب کیا فکر کرتے ہیں اب آپ وائس چانسلر ہیں اپنی یونیورسٹی کے خزانہ دار کو فون کریں اور انھیں کہیں وہ سارا بندوبست کر دیں۔ یہ سن کر پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب خوش ہوئے کہ چلو یونیورسٹی جاتے ہیں جب وہ رحیم یار خان پہنچے تو پتہ چلا کہ یونیورسٹی کا تو وجود ہی نہیں اور وہاں کسی

کو پتا ہی نہیں تھا کہ نیا وائس چانسلر کون ہے؟ حقیقتِ احوال یہ تھی کہ یونیورسٹی صرف کاغذوں میں بنی ہوئی تھی اور اصلاتاً اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔

جب پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نے وہاں چارج لیا تو یونیورسٹی کے فنڈز ہی نہیں تھے۔ تین ماہ بعد انہیں پہلی تنخواہ ملی۔ یہ منصوبہ ایک سال تک صرف کاغذوں اور اخباری اشتہارات کی صورت میں پنپتا رہا تاوقت یہ کہ پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب نے اس صورت حال پر قابو پانے کے لیے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر دیں۔ اپنی فہم وفراست سے اس یونیورسٹی کو کاغذوں سے نکال کر رحیم یار خان کے لوگوں کے لیے ایک جیتی جاگتی تعبیر بنا دی۔

ایک سال تک UET لاہور کے زیرِ سایہ یہ یونیورسٹی صرف وزیر اعلیٰ کو خوش کرنے کیلئے اخبار میں اشتہار دیتی اور اس کے بعد بھول جاتی بڈز آتیں مگر اسے کینسل کر دیا جاتا۔ بڈز کینسل ہونے سے دو نقصانات ہو رہے تھے جس میں پہلا تو وقت کا زیاں اور دوسرا وقت گذرنے کے ساتھ منصوبہ کی مالیت بڑھتی جا رہی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ کنٹریکٹرز میں یہ تشویش پھیلتی جا رہی تھی کہ یہ بوگس منصوبہ ہے اور صرف کاغذوں کی حد تک ہے جس سے وہ اگلی بار بڈز میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت UET لاہور کے وائس چانسلر ریٹائرڈ جنرل اکرم تھے۔ وہ سترہ سال تک UET کے وائس چانسلر رہے۔ ان کے جانے کے بعد نئی انتظامیہ نے بھی اس منصوبہ کو پسِ پشت ڈالا جن میں فضل خالد بھی شامل ہیں جو چیئرمین پی ایچ ای سی بھی رہے ہیں۔

یوں مزید ایک سال تک یہ پراجیکٹ پسِ پشت ڈالا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ اہلیانِ شہر یہ کہنے لگ گئے کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں کیوں کہ یہ منصوبہ تو ختم ہو چکا ہے۔ اللہ سبحان وتعالی ہر کام کی انجام دہی کیلئے مناسب بندہ چنتے ہیں اور اس کام کی تکمیل کے لیے جسے منتخب گیا وہ پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب تھے۔ اگرچہ انھیں اس سب کے لیے وقت، قوّت اور وسائل استعمال کرنا پڑے مگر اس سلسلہ میں ان کا پچھلا تجربہ جو انھیں

صفا یونیورسٹی کو قائم کرتے وقت ہوا اس سے کافی مدد ملی مگر وہ جو خواب لے کر آئے تھے کہ یہاں ایک یونیورسٹی ہو گی جہاں جا کر وہ تعلیمی میدان میں اس کو آگے لے کر جائیں گے مگر یہاں انھیں جامعہ کی عمارت کو تعمیر کروانا پڑا حتی کہ انھیں اپنی جوائننگ رپورٹ اور چارج لینے، دینے کے لیے بھی لاہور جانا پڑا۔ یہ صورت حال ویسی ہی تھی جیسا کہ گذشتہ ادوار میں سے وہ گذر کر آئے تھے۔ سرخ فیتہ اور منفی سوچ پہلی مرتبہ اپنی بھیانک شکل میں ڈاکٹر اطہر محبوب کے سامنے آئی۔ طرح طرح کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔ انکوائریز بھگتیں مگر دھن کا یہ پکا شخص یونیورسٹی کی بہترین شکل میں تعمیر کا خواب پورا کر گیا۔

خواجہ فرید یونیورسٹی اب رحیم یار خان میں پوری شان کے ساتھ فروغِ علم میں مصروف ہے۔ وہاں کے عوام ڈاکٹر محبوب کے شکر گذار ہیں جو انہیں خواجہ فرید یونیورسٹی کا تحفہ دے گیا۔ اِس ناممکن کام کی اتنے مختصر وقت میں اتنی شان دار تکمیل پر اس وقت کا صوبہ کے وزیرِ اعلیٰ شہباز شریف بھی رطب اللسان ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جامعہ کی بھری محفل میں کہا کہ ڈاکٹر اطہر محبوب کی موجودگی سے یہ جامعہ آکسفورڈ سے بھی آگے جائے گی۔ اس پراجیکٹ کی تکمیل جوئے شیر لانے کے برابر تھی۔ لوگوں کے اعتماد کو بحال کیا گیا اور سب سے بڑھ کر HED، گورنمنٹ آف پنجاب اور سیاسی مخاصمتوں پر مبنی لابی کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کرنا پڑا جو نہیں چاہتے تھے کہ اس پسماندہ خطّہ کی جہالت دور ہو۔ کوششیں کی گئیں کہ پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کو وزیرِ اعلی سے ملاقات نہ ہو پائے۔ ان چالوں میں افسرِ شاہی ایسے لوگوں کے آلہ کار بن جاتے اور کوشاں رہتے کہ بہ ہر صورت وزیرِ اعلیٰ کو وائس چانسلر کے خلاف اکسایا جائے۔ جب بھی وزیرِ اعلی سائٹ پر تشریف لاتے تو حیلے بہانوں سے وائس چانسلر کو گمراہ کرنے اور ان کو وزیرِ اعلیٰ سے دور رکھنے کی سازشیں رچی جاتیں ایک دفعہ چیف منسٹر کے دورہ یونیورسٹی پر پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کو ڈی سی، اے ڈی سی اور پوری مشینری جو رحیم یار خان میں تعینات تھی، نے کہا کہ آپ کی ملاقات سی ایم سے یہاں متوقع تھی جو تبدیل کر کے بہاول پور کر دی گئی ہے۔ 2016ء میں

پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب اور ان کی ٹیم نے سب کچھ یونیورسٹی کی سائٹ پر تیار کیا ہوا تھا کہ سی ایم اسی جگہ پر کھڑے ہو کر دیکھیں گے مگر اس کے بعد انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ بہاول پور کیلئے نکل پڑے جب یونیورسٹی کے گیٹ پر پہنچے تو ایک اجنبی شخص گیٹ پر ملا اور پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں آپ واپس جائیں وزیر اعلیٰ تو یہاں پہنچنے والے ہیں اور ٹھیک پچیس منٹ بعد وزیر اعلیٰ شہباز شریف خواجہ فرید یونیورسٹی پہنچ گئے ۔سازشیوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ سی ایم کے سامنے پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کو سبکی کا سامنا کرنا پڑے اور یہ لوگ وزیر اعلیٰ کے کان بھر سکیں کہ آپ خود دیکھیں کیسا وائس چانسلر ہے جو آپکی قدر نہیں کرتا۔

ایسے بارہا واقعات رحیم یار خان کی خواجہ فرید یونیورسٹی میں پیش آئے جن کا مقصد پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کو ناکام بنانا تھا۔ یہ سلسلہ گذشتہ سات سال سے جاری ہے جس میں بیش بہا انکوائریز، سی ایم آئی ٹیز کا قیام اور دیگر منفی پراپیگنڈا کیا گیا مگر اس سب کے باوجود ڈاکٹر اطہر نے خواجہ فرید یونیورسٹی کے تعمیری منصوبہ کو انتہائی قلیل مدت میں پایہء تکمیل تک پہنچایا۔

ایسے عناصر جامعہ اسلامیہ میں بھی برسرِ پیکار رہے مگر مشیتِ خداوندی کے سامنے سب کو جھکنا پڑتا ہے ۔ ایسے عناصر کو سوائے ندامت، شرمندگی اور یاس کے کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ڈاکٹر اطہر کی محنت او صلاحیت کا ثبوت خواجہ فرید یونیورسٹی کی صورت میں موجود ہے جس کے افتتاح کے موقع پر اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ شہباز شریف جب خواجہ فرید یونیورسٹی کی چھ نئی عمارتوں کے افتتاح کے لیے مئی 2018ء میں تشریف لائے تو انھوں نے ڈاکٹر اطہر محبوب کے کام ،محنت اور لگن کی تعریف کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ وہ مزید دس ارب روپے اس یونیورسٹی کی ترویج و تکمیل کے لیے دیں گے۔ یہ ان کا ڈاکٹر اطہر محبوب پر اعتماد اور ان پر کیخلاف جانیوالی ریشہ دوانیوں کا منہ توڑ جواب تھا جو انکے ناقدین کے لیے کافی ثابت ہوا۔

خواجہ فرید یونیورسٹی رحیم یار خان میں اپنی وائس چانسلرشپ کی کامیاب مدّت کی تکمیل کے بعد سرچ کمیٹیوں میں نئے وائس چانسلرز کی تلاش کے لیے فروری 2019ء میں ایک اشتہار شائع ہوا جس پر ڈاکٹر اطہر محبوب نے انجینئرنگ یونیورسٹیوں اور جنرل یونیورسٹیوں میں وائس چانسلر کے عہدہ کے لیے درخواستیں دیں۔کئی انجینئرنگ یونیورسٹیوں میں ان کی پوزیشن، دوسری یا تیسری بنی سرچ کمیٹیوں نے کافی مثبت ردّعمل ظاہر کیا مگر جب نتیجہ آیا تو ناگزیر حالات کی وجہ سے مناسب نہیں سمجھا گیا کہ ڈاکٹر اطہر محبوب کو منتخب کیا جاتا۔ خاص طور پر یو ای ٹی ٹیکسلا کیلئے ان کا نام ابتدائی امیدواران کے لیے چنا گیا مگر بعد میں اسے تبدیل کر کے دوسرا وائس چانسلر بھیج دیا گیا۔ اس خفگی کا اظہار اپنے اگلے انٹرویو میں ڈاکٹر اطہر محبوب نے سرچ کمیٹی کے سامنے برملا کیا جب انھیں جنرل یونیورسٹیوں کے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ان کی اس خفگی پر اس سرچ کمیٹی کے سربراہ آفتاب خالد نے کہا کہ ہم آپ کو پہلے ہی پرکھ چکے ہیں۔

جس پر ڈاکٹر اطہر محبوب نے کہا کہ، جی ہاں ! کئی دفعہ مگر آپ کا نظرِ انتخاب میں نہیں تھا، کوئی اور رہا اور کسی بھی یونیورسٹی کیلئے منتخب نہیں ہوا۔اس پر آفتاب خالد جو انتہائی اصول پسند اور دیانت دار شخصیّت کے مالک ہیں، نے انتہائی باوقار انداز میں کہا کہ آپ اس بات کی فکر نہ کریں کہ آپ ہمارا نظرِ انتخاب نہیں آپ ایک مضبوط امیدوار ہیں اور میرٹ پر ہیں ۔ ان چار یونیورسٹیوں میں سے اپنی ترجیحات بتا دیں۔ اس پر ڈاکٹر اطہر محبوب نے پہلی ترجیح جامعہ اسلامیہ بہاول پور کو دی اور اس کے بعد باقی تین یونیورسٹیوں کو ترجیح دی۔ یہ ترجیح اس لئے لی گئی کہ وہ اس حوالہ سے کچھ دن پہلے انٹرویو لے چکے تھے اور قائل ہو چکے تھے کہ کس کو کیا ذمّہ داریاں دینا ہیں ۔بنیادی طور پر ہر وائس چانسلر کو اس کی ترجیحات کے عین مطابق متعلقہ یونیورسٹیوں میں بھیجا جانا تھا۔آفتاب خالد اور بابر علی کے درمیان کافی خلیج رہی ہے مگر اس سب کے باوجود اور کافی مخالفت کے ہونے کے باوجود بھی آفتاب خالد کیوں کہ انصاف پسند شخص ہیں اس لئے انہوں نے میرٹ پر فیصلہ

دیا۔ آفتاب خالد، ڈاکٹر اطہر محبوب کے ساتھ ایکریڈیٹیشن کونسل میں بھی ساتھ رہے ہیں تو ڈاکٹر اطہر محبوب کو اندازہ تھا کہ یہ شخص ایک انچ بھی اپنے اصولوں، قواعد وضوابط اور میرٹ سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔

ڈاکٹر اطہر محبوب اور آفتاب خالد دو الگ قسم کی شخصیات ہیں۔ ڈاکٹر اطہر محبوب لچک دار طبیعت کے مالک ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کسی کا مسئلہ اگر حل ہو سکتا ہے تو قانون میں جہاں لچک ہو وہاں تک اس انسان کو بلا کم و کاست مفاد دیا جائے۔ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ بہتری کا عمل تدریجی ہوتا ہے۔قوانین انسانوں کی فلاح کے لیے بنائے جاتے ہیں اور اس کا فائدہ بحیثیتِ مجموعی انسانوں کو پہنچنا چاہیے۔ کسی انسان کو ان سے نقصان نہیں پہنچنا چاہیے کسی کو مجبور کر کے اس کا نقصان کر کے یا ڈنڈے کے زور پر تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ تبدیلی وہ جو رویّوں میں پیدا ہو اور اگر Cost analysis of benefit کیا جائے کہ اس تبدیلی سے کتنا ضرر پہنچا تو اس میں اگر لوگوں کو زیادہ فائدہ مل سکے تو بہتری کی بات ہے اس میں فائدہ زیادہ کریں اور نقصان کم سے کم کریں تا کہ مجموعی طور پر انسانوں کو فائدہ پہنچے۔

بہ ہر کیف سرچ کمیٹی نے ڈاکٹر اطہر محبوب کو جامعہ اسلامیہ کے لیے منتخب کیا مگر اس کے بعد پیش آمدہ مراحل طویل تر ہوتے گئے جس میں بہاول پور کے علاقائی سیاست دانوں نے بھرپور کوشش کی کہ ڈاکٹر اطہر محبوب کو جامعہ اسلامیہ کی وائس چانسلرشپ سے ہر ممکن دور رکھا جائے۔

یہاں تک کہ جب گورنر پنجاب چوہدری سرور نے انہیں فون کر کے مبارک باد دی تو برملا کہا کہ! بیٹا میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ تمہیں یہاں کا وائس چانسلر تعینات کرنے میں کس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی رفقاء کی مخالفت کا سامنا کیا مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں میرٹ پر فیصلہ کروں گا ور میرٹ کے ساتھ کھڑا رہوں گا۔ ڈاکٹر اطہر محبوب کو اس بار بھی خواجہ فرید یونیورسٹی کی طرح، وزیر اعلیٰ کو انٹرویو دینے کے بعد منتخب کیا گیا یہاں

بھی ان کو اس سیاسی مخالفت کی وجہ سے تیسری بار وزیر اعلیٰ عثمان بزدار کے سامنے پیش ہونا پڑا جہاں ان کا انٹرویو آدھ گھنٹا ہوا اور تمام فلٹرائزیشن کے بعد انھیں جامعہ اسلامیہ کا وائس چانسلر منتخب کیا گیا۔ اس کے برعکس باقی تین یونیورسٹیوں میں وائس چانسلرز کو سرچ کمیٹی کی سفارشات پر منتخب کیا گیا مگر بہاول پور کے مقامی سیاست دانوں کی مخالفت کے باعث انہیں پل صراط کا سفر طے کرنا پڑا اور آخر کار جیت میرٹ کی ہوئی اور وہ وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاول پور منتخب ہو کر آ گئے۔

رستہ ہی نہیں جو ترے قدموں کو نہ چُومے
منزل ہی نہیں جو تری ٹھوکر میں نہیں ہے

اس نابغہ شخصیت کو 2019ء میں اسلامیہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ ایک نئے شہر میں نئی ذمہ داری نبھانے کا عمل شروع ہوا۔ محض دو سال کی مختصر مدت میں اسلامیہ یونیورسٹی تدریسی اور انتظامی حوالہ سے کئی درجہ ترقی کر گئی۔ طلبا کی تعداد پچاس ہزار سے تجاوز کر گئی۔ نئے شعبے بنے، نئے اساتذہ اور محققین کی تعیناتیاں ہوئیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی کا ایک شان دار تشخص اندرون و بیرونِ ملک قائم ہوا۔ جامعہ اسلامیہ میں رئیس الجامعہ بن کر جب ڈاکٹر اطہر محبوب چارج لینے کے لیے عبوری وائس چانسلر ڈاکٹر عامر اعجاز کے پاس تشریف لائے تو اسی وقت ویٹرنری کونسل کا دورہ جامعہ اسلامیہ میں متوقع تھا اور ڈاکٹر عامر اعجاز نے انہیں کہا کہ آپ اس دورہ میں بہ طور وائس چانسلر سربراہی کریں۔ ڈاکٹر اطہر محبوب نے انہیں کہا کہ میں نے تو ابھی چارج لیا ہے آپ اس کی سربراہی کریں مگر ڈاکٹر عامر اعجاز کے اصرار پر انھیں جانا پڑا۔ وہاں جب پہنچے تو صورت حال بہت گمبھیر تھی۔ ویٹرنری کونسل کے ممبران اور سربراہ نے جامعہ اسلامیہ میں قائم اس شعبہ کو کافی برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ جامعہ اسلامیہ جھوٹ بولتی ہے، فریب کر رہی ہے اور طلباء کے مستقبل کے ساتھ کھیل رہی ہے آپ کے پاس متعلقہ سامان، لیب اور دیگر چیزوں کی کمی ہے جو آپ گذشتہ تیرہ سالوں سے وعدہ کرتے آ رہے ہیں اور تا حال دست یاب نہیں

کیں۔ ہم اس سینٹر کو بند کر دیں گے۔

الغرض! بہت تلخ کلامی ہوئی۔ ڈاکٹر اطہر محبوب بطور وائس چانسلر ان سے معذرتیں کرتے رہے کہ میں آج آیا ہوں اور کوشش کروں گا کہ تمام وسائل دست یاب کر دوں۔ مگر پروفیسر انجینئر ڈاکٹر اطہر محبوب کو یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ کونسل کیوں اس طرح پیش آرہی تھی عقدہ بعد میں کھلا کہ وہ سب اس لئے کہہ رہے تھے کہ وہ بہاول پور میں قائم چولستان ویٹرنری یونیورسٹی کو مضبوط کرنے کیلئے جامعہ اسلامیہ میں قائم مراکز کو تضحیک کر کے بند کرنا چاہتے ہیں اور اسی وجہ سے ڈس انفارمیشن پھیلا رہے ہیں۔

ویٹرنری کونسل کے اس گروپ کی ہمدردیاں دراصل ان کے ساتھ تھیں اور وہ جامعہ اسلامیہ کا سنٹر بند کروانا چاہتے تھے۔ سینڈیکیٹ کا فیصلہ بھی اس حوالہ سے بڑا اچھا تھا کہ جامعہ اسلامیہ اسے ہرگز بند نہیں کرے گی اور اپنے محدود وسائل سے اس ویٹرنری مرکز کو چلائے گی۔

2019ء سے 2021ء تک ان دو سالوں میں ڈاکٹر اطہر محبوب اور شعبہ ویٹرنری کے رفقاء نے مل کر جامعہ اسلامیہ میں قائم ویٹرنری مرکز کو مقابلتًا بہتر بنا لیا ہے۔ اب ویٹرنری کونسل میں بھی کافی سازگار گروپ موجود ہے جو جامعہ اسلامیہ کو عزّت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور کسی قسم کے تعصّب کا شکار نہیں ہے۔ اس وقت جامعہ اسلامیہ کے ویٹرنری کالج کی ریٹنگ بہت بہتر ہو چکی ہے۔

مخاصمت، مسابقت اور تعصّب جب تک مثبت نہ ہو، نہ تو ادارے پنپتے ہیں نہ ہی قومیں بامِ عروج حاصل کر پاتی ہیں۔ پاکستان میں بالعوم اور بہاول پور میں بالخصوص لائیوسٹاک کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ دو مراکز بہت کم ہیں اس علاقہ کے لائیوسٹاک کو بہتر کرنے کیلئے۔ سرکاری اداروں کا مقصد کسی ادارہ کو بند کروانا نہیں ہونا چاہئے یا یہ بھی نہیں کہ اپنی اولاد سے محبت دوسرے کی اولاد سے نفرت ظاہر کر کے دکھائی جائے۔ ادارہ جو بھی ہو، ڈاکٹر اطہر محبوب کی نظر میں وہ ادارہ ملک و قوم کی خدمت کرے۔ انسانیت کی

فلاح میں پوری لگن، تن دہی کے ساتھ اپنی ذمّہ داریوں کا مظاہرہ کرے۔ مل جل کر تمام ادارے کام کریں تو پاکستان کے لوگوں اور پاکستان کی قسمت سنور سکتی ہے۔

بہاول پور ہو یا رحیم یار خان، یونیورسٹی خواجہ فرید ہو یا جامعہ اسلامیہ دونوں اس خطّہ کے لوگوں کے لیے علم کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ہی پٹّی ہے جہاں ایک ہی قسم کے لوگ یکساں زبان بولنے والے، ایک جیسی تہذیب و تمدن سے وابستہ ہیں۔ تنوّع شہری اور دیہی زندگی میں نظر آتا ہے فرق صرف سہولیات کی فراہمی و عدم فراہمی کا ہے۔

بہاول پور میں اسلامیہ یونیورسٹی 1975ء سے قائم ہے اس لئے یہاں تہذیب و تمدن، اخلاق و خوش اخلاقی زیادہ پائی جاتی ہے جبکہ رحیم یار خان میں یونیورسٹی کا قیام 2014ء میں ہوا اس لیے وہاں دیہی ثقافت، بودوباش قدرے قدامت پسندانہ ہیں۔ رحیم یار خان ایک صنعتی زون ہے اس لیے وہاں لوگوں میں دولت کی فراوانی ہے جس کا اظہار ان کے رویّوں اور رہن سہن سے نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس بہاول پور کیوں کہ ریاست کا دارالخلافہ رہا لہٰذا یہاں ادبی ذوق، تعلیمی رجحان اور اس شہر کی تہذیب بڑے شہروں سے میل کھاتی ہے۔ مجموعی طور پر ان دونوں خطوں کا موازنہ کیا جائے تو یہاں رہنے والے لوگوں، طلباء و طالبات میں کئی قدریں مشترک نظر آتی ہیں اور کئی جگہوں پر مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔

لوگوں کو اپنی مادرِ علمی کی ترقی پر ناز ہونا شروع ہوا۔ تحقیق کے شعبوں میں ایسا نمایاں کام ہوا جس کی گونج یونیورسٹی کے مرکزی آڈیٹوریم میں اس وقت سنائی دی جب وزیر اعظم عمران خان نے کہا کہ وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ ڈاکٹر اطہر محبوب، مَیں تحقیق و تعلیم کے فروغ کے لیے آپ کی کاوشوں میں آپ کے ساتھ ہوں اور وزیر اعلیٰ پنجاب آپ کے ساتھ بھرپور تعاون کریں گے۔

ڈاکٹر اطہر محبوب، وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ نے جامعہ کو تیز رفتار ترقی کی راہوں پر گام زن کر دیا اور ان کے دور میں جہاں روزگار کے نئے مواقع پیدا ہوئے وہاں

پر اکیڈیمیا کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ جامعہ اسلامیہ تیزی سے ترقی کے منازل طے کر رہی ہے خواہ وہ رینکنگ ہو، بین الاقوامی روابط ہوں، کھیل کا میدان ہو، کانفرنسز ہوں، سماجی خدمات ہوں یا ملکی و قومی سلامتی کے معاملات ہوں جامعہ اسلامیہ کے طلباء، اساتذہ، انتظامیہ و دیگر آفیسران اپنی بھر پور صلاحیتوں سے پاکستان کا نام اقوامِ عالم میں اونچا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

طلبا کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے، انہیں معاشرے کا کار آمد فرد بنانے اور جامعات میں غیر نصابی سرگرمیوں کے فروغ کے لئے جامعہ اسلامیہ بہاول پور نے پاکستانی تاریخ میں پہلی مرتبہ وسیع پیمانے پر اسٹوڈنٹس سوسائٹیز کا نیٹ ورک قائم کیا تا کہ جامعہ میں غیر نصابی سرگرمیوں میں اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے مؤثر ادارہ جاتی پلیٹ فارم مہیا کیا جا سکے۔ ان سوسائٹیز کے قیام کا ایک مقصد جامعہ میں صحت مند مسابقتی ماحول پیدا کرنا بھی ہے۔ یوں رئیس الجامعہ کی تحریک پر بننے والی یہ سوسائٹیاں طلبا وطالبات کی صلاحیتوں کو اجاگر کر رہی ہیں۔ ان طلبا سوسائٹیز کو مزید مضبوط کرنے کے لیے ان کے باقاعدہ قوانین مرتب کیے گئے ہیں اور ڈائریکٹوریٹ آف سٹوڈنٹس آفیئرز ان کے انتظامی امور کا ذمہ دار ہے۔ طلبا کو یونیورسٹی اور قومی و بین الاقوامی سطح پر مختلف سرگرمیوں میں شرکت کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ اسٹوڈنٹس سوسائٹیز نیٹ ورک کا مقصد جامعہ اسلامیہ کے طلبا کی سرگرمیوں، مقابلوں کا انعقاد، تجربات اور معلومات کا اشتراک ہے۔ جبکہ با صلاحیت طلبا کی مہارت کو بروئے کار لانے اور یونیورسٹی کیمپس میں طلبا کی موثر مصروفیت سے متعلق بھی یہ نیٹ ورک اہم کام کر رہا ہے۔ رئیس الجامعہ اطہر محبوب کی رائے میں ان سوسائٹیوں سے طلبا کی توجہ کو صحیح سمت میں موڑنا، غیر نصابی سرگرمیوں اور جامعات کے طلبا میں رواداری کا فروغ بھی وقت کی ضرورت ہے۔ اس طرح جامعہ سے فارغ التحصیل طلبا کامیاب اور پر اعتماد شہری بن کر جامعہ سے نکلیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ ملازمت فراہم کرنے والے ادارے ایسے طلبا کو ترجیح دیتے ہیں جو معاشرتی میل جول میں تجربات رکھتے

ہیں۔

اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی مختلف ڈائریکٹوریٹس کا قیام ہے جسے عدم مرکزیت کے اصولوں کو اپناتے ہوئے عمل میں لایا گیا۔ ان ڈائریکٹوریٹس میں، ڈائریکٹوریٹ آف ایڈمشن، ڈائریکٹوریٹ آف اکیڈیمکس، ڈائریکٹوریٹ آف انفارمیشن اینڈ ٹیکنالوجی، ڈائریکٹوریٹ آف ای ٹی سی، ڈائریکٹوریٹ آف کمیونٹی براڈکاسٹ ریڈیو، ٹی وی اینڈ فلم، ڈائریکٹوریٹ آف کمیونیکیشن اینڈ پبلک ریلیشنگ، ڈائریکٹوریٹ آف انٹرنیشنل لنکجز اورڈائریکٹوریٹ آف فنانشل ایڈ و دیگرشامل ہیں۔ ان ڈائریکٹوریٹس کے سربراہ اپنے اپنے شعبہ کے ماہرین اساتذہ و انتظامی افسران کومقرر کیا گیا ہے۔

ان کے اس دور میں اساتذہ کی تقرّریاں و دیگر آسامیوں پر تقرّر ریمیرٹ پر اور ضرورت کے حساب سے کیا جارہا ہے۔ اساتذہ کی تقرری کرتے وقت ان کا معیارِ انتخاب ایسے اساتذہ ہیں جو عرصہ دراز سے یونیورسٹی کے لئے خدمات سرانجام دیتے چلے آرہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے 300 اساتذہ کو ترقی دی جو گذشتہ کئی برسوں سے زیرِ التوا تھیں اور اس کے علاوہ ان دو سالوں میں جامعہ اسلامیہ میں جہاں اس وقت طلباء کی تعداد دس ہزار سے بڑھ کر پچاس ہزار ہوگئی ان کے لیے 500 نئے اساتذہ کی تقرّری کی گئی جن میں سے 300 تقرّریاں Associate Lecturers کی ہیں یہ وہ نوجوان مرد و خواتین ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور ان میں سے اکثریّت تازہ ایم ایس یا پی ایچ ڈیز ہیں جو Grade 17 میں Induct کئے گئے ہیں اور ان کو یہاں موقع دینے کے پیچھے یہ سوچ کارفرما ہے کہ یہ کچھ عرصہ یہاں بہ طور استاد، وہ اپنی انٹرن شپ پوری کریں۔ جونہی یونیورسٹی میں نئی نشستیں خالی ہو یہ لوگ اپنا تجربہ پورا کر چکے ہوں اور یوں یونیورسٹی اپنے انکوبیٹر میں سینچے گئے تجربہ کار اساتذہ کی Lot میں سے نکال کر انہیں یونیورسٹی میں ہی جگہ دے دی جائے۔

ان ایسوسی ایٹ لیکچررز کی تقرری کا طریقہ کار انتہائی شفاف بنایا گیا جس میں

معیاری ٹیسٹ سے ان کی سکروٹنی کر کے کوالیفائی کرایا گیااور اس کے بعد ان کا انٹرویو لیا گیا جس میں انہیں اپنی اہلیّت کو ثابت کرنا تھا۔

میرٹ اور شفافیّت دو ایسے زرّیں اصول ہیں جن سے کسی بھی قوم کی ترقی ممکن ہے۔ ان کے ساتھ 200 نئے اسسٹنٹ پروفیسر کی تقرّری کی گئی اس میں بھی میرٹ کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے نوجوان پی ایچ ڈیز کو لگایا گیا جہاں پر ایسے امیدوار جو ابلاغ اور تعلیمی میدان میں اعلیٰ سطحی پوزیشنز رکھتے ہیں انھیں مختلف شعبہ جات میں تعینات کیا گیا اور اس میں ایسے لوگ جو اپنے شعبہ جات کے ماہر ہیں ان سے سکروٹنی کروائی گئی اور اہل امیدواران کو مکمل مراحل سے گذار کر اپنے اپنے شعبوں میں ضرورت کے مطابق رکھا گیا۔

اس لحاظ سے استاد اور شاگرد کی شرح کو ایک معیاری سطح پر لایا گیا ہے اگرچہ ابھی بھی یہ سطح عالمی معیار اور HEC کے معیار کے مطابق تو نہیں مگر محدود وسائل کو مدّنظر رکھ کر جامعہ اسلامیہ کو عالمی اور قومی معیار کی ایک یونیورسٹی بنانے کی طرف بہترین حکمتِ عملی کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے نہ صرف اس خطّہ میں بیروزگاری میں کمی ہوئی ہے وہیں پر تعلیمی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوا اور نوجوان اساتذہ کی یونیورسٹی میں تقرّری نے یونیورسٹی کے تحرک میں اضافہ کر دیا ہے۔ کئی شعبہ جات سائنس اور آرٹس دونوں میں ہی رئیس الجامعہ ڈاکٹر اطہر محبوب نے پیش اقدام کرتے ہوئے اور ایسے شعبے جو اپنی اہمیّت و افادیّت معاشرتی اعتبار سے کھوتے جا رہے تھے ان کی بحالی کے لیے اقدامات کئے جیسے اردو اور عربی کے شعبے و دیگر جہاں اساتذہ کی اشد ضرورت تھی وہاں ایسے اساتذہ کی تقرّری عمل میں لائی گئی جو ادبی ذوق رکھتے ہیں اور نصابی، تعلیمی و ابلاغی میدان میں انکا کوئی ثانی نہیں اور جنھوں نے اپنی علمی گفتگو اور ادبی ذوق سے دورانِ انٹرویو متاثر کیا۔

دورانِ بورڈ انٹرویوز آرٹس کے شعبہ سے منسلک امیدواروں نے بہ نسبت سائنس امیدواران زیادہ بہتر انداز میں متاثّر کیا کہ وہ اپنے مضمون اور اپنی دل چسپیوں سے متعلق زیادہ بہتر انداز میں بیان کر پائے جبکہ سائنس کے شعبہ کے امیدواران اپنے

موضوع اور اپنی دل چسپی کے میلانات کا اتنے بہتر انداز میں دفاع نہیں کر پائے، اس کا ایک مطلب سائنس کے مضمون میں لیبارٹریز کی کمی ہے۔ اس لئے ایسے امیدواران جو اپنے مضمون پر گرفت نہیں رکھتے یا وہ اپنے موضوع کو ہی بیان نہیں کر پائے تو ایسے کسی امیدوار کو فیکلٹی میں نہیں رکھا گیا۔ ایسے امیدوار بھی آئے جو پی ایچ ڈی تو تھے مگران کی ڈگری صرف کاغذ کے ایک ٹکڑے سے بڑھ کر کچھ نہیں تھی۔ ایسے امیدواراں کی حوصلہ شکنی کی گئی ۔اُن سے کہا کہ وہ بہتر تیّاری کے ساتھ دوبارہ انٹرویو بورڈ کے سامنے پیش ہو اور اپنی اہلیّت کو ثابت کریں ۔ مزید برآں منتخب شدہ امیدواران کے لئے کئی تربیّتی ورکشاپوں کا بندوبست کیا گیا جس میں ریٹائرڈ اور حاضر سروس پروفیسرز صاحبان کی خدمات حاصل کی گئیں جنہوں نے ایسے امیدواروں کی تربیّت کروائی اور انہیں پڑھانے کی بہترین تربیّت کے بعد کمرہ جماعت میں بھیجا گیا۔

روشن اقدام

جامعہ اسلامیہ کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ یہاں جیّد اساتذہ کی کمی نہیں رہی اور یہ احسن اقدام کہ قدیم اور جدید تجربات سے مزیّن ایک ایسی بھرپور شخصیّت کو بہ طور استاد تیار کیا جائے جو اپنے طلباء و طالبات کے لیے ایک رول ماڈل رہے اور وقت کے ساتھ تجربات کی بھٹی میں پک کر سونا بن جائے۔

اس لحاظ سے ڈاکٹر اطہر محبوب قابلِ صد تحسین ہیں کہ انھوں نے جامعہ اسلامیہ میں اساتذہ کی کمی کو کسی حد تک پورا کیا اور پاکستان میں موجود بہترین دماغوں کو منتخب کیا۔ اساتذہ کی تربیّت کر کے انھیں جامعہ اسلامیہ کی فیکلٹی میں شامل کیا۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر اطہر محبوب ان لوگوں میں سے ہیں جو مسئلہ کو شناخت کر کے اس کے ممکنہ حل کی طرف جاتے ہیں۔ ایک مثبت سوچ کا حامل شخص ایسا ہی کرتا ہے کہ وہ مسئلہ کو حل کی طرف لے جاتا ہے نہ کہ وہ بیٹھ کر پچھتاتا رہے کہ میں یہ پہلے کر لیتا تو شاید بہتر ہوتا۔ ہر مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مختلف طریقے ہوتے ہیں یہ تو آپ کی ذہانت کا امتحان ہے کچھ لوگ حل کرتے ہوئے اس میں الجھ جانے کی بجائے آسانی کی طرف لے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اطہر محبوب اس بات پر عقیدۂ راسخ رکھتے ہیں کہ اداروں میں سے ٹیمیں بنیں اور جو بھی ٹیلنٹ ملتا جائے اسے ادارہ کی ترقی و ترویج میں شامل کر کے آگے بڑھا جائے۔ ڈاکٹر اطہر محبوب یونیورسٹی میں تعلیم و تربیّت کے لیے جس ماڈل کو ترویج کرنا

چاہتے ہیں وہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے تعلیمی نظاموں میں رائج ہے اور بہ خوبی چل رہا ہے ان کے تصوّر شدہ ماڈل کا نقشہ پیش خدمت ہے۔

اس ماڈل کی توجیح یہ ہے کہ یونیورسٹی میں موجود اساتذہ کی تعداد اس وقت شرح کے لحاظ سے 60 طلباء کے لیے ایک استاد ہے جو کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر انتہائی کم تر درجہ ہے اور اس سے یونیورسٹی کی رینکنگ پر بہت اثر پڑتا ہے۔ جو ایک مثالی شرح ہے وہ 20 طلباء کیلئے ایک استاد ہونا ضروری ہے۔ دوسرا یہ کہ یونیورسٹی کی معاشی حالت اس طرح نہیں ہے کہ اتنا زیادہ ادائیگی کی جا سکے۔

اس صورتحال میں دنیا بھر میں Peer Taching اور Team Teaching کو تجویز کیا جاتا ہے اور اسی ماڈل کی طرز پر یونیورسٹی کی اکیڈیمیا کو ترویج دی جاتی ہے جس میں تمام یونیورسٹی پروفیسرز کے ساتھ ایسوسی ایٹ لیکچررز منسلک کئے جاتے ہیں جس کا اطلاق اور منظوری 2020ء میں سینڈیکیٹ سے لیکر ایم فل ، پی ایچ ڈی فارغ التحصیل اساتذہ کی تقرّری عمل میں لائی جا چکی ہے اور اس ماڈل کی بدولت اساتذہ کی کمی کو پورا کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مزید اساتذہ کو اس ماڈل کے تحت ٹیچنگ اسسٹنٹ کے طور پر بھرتی کیا جائے گا اور یہ اساتذہ اسی ڈیپارٹمنٹ کے High Achievers ہوں گے۔ طالبعلموں کو کسی موضوع پر کوئی بات سمجھ نہیں آئی یا وہ اس کو دوبارہ پڑھنا چاہتے ہیں یا Assignment کی تکمیل میں اسے مدد چاہیے تو یہ ٹیچنگ اسسٹنٹ اسے مدد مہیّا کرے گا۔ اس کے ساتھ جو طلباء و طالبات بی ایس یا ایم اے کے اچھے طالبِ علم رہے اور انکے گریڈز اچھے آئے ہیں انھیں ان کی ڈگری کی تکمیل پر اسی ڈیپارٹمنٹ میں اپنے اساتذہ کے ساتھ ملکر پڑھانے کا موقع ملے گا۔ اس کا بنیادی مقصد جو اس وقت پوری دنیا کو درپیش ہے اور وہ چاہ رہے ہیں کہ تعلّم کو بڑھایا جائے اس سلسلہ میں ماہرینِ تعلیم یہ کہتے ہیں کہ صرف استاد کافی نہیں ہے کہ وہ چالیس یا پچاس طلباء کی تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکے اور تین گھنٹے کی کلاس میں یہ ممکن نہیں کہ تمام معلومات طالبِ علم تک پہنچ سکیں۔

ایسی صورتحال سے نمٹنے کیلئے ایک پورے نیٹ ورک کی ضرورت ہے جس میں یہ تمام لوگ مل کر طالبِ علم کو مدد دیں۔ اس میں پروفیسر، اے ایل، ٹی اے اور ایل اے مل کر کام کریں گے جو بہتر نتائج حاصل کرنے میں مددگار ہوں گے۔ Peer Teaching کا یہ تصوّر جدید ممالک میں لاگو کیا جا چکا ہے جس میں چوتھے سمسٹر کا فارغ التحصیل اپنے تیسرے سمسٹر والے ساتھی کو پڑھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کا فائدہ یوں ہوگا کہ استاد سے طالبِ علم جھجکتے ہیں یا کچھ پوچھنے سے گھبراتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اساتذہ پر فرائض کا بوجھ بڑھا ہوتا ہے اور انکے پاس وقت کی قلّت ہے تو ایسی صورت میں ایل اے طلباء کو ہمہ وقت دست یاب ہے اور وہ اس سے مدد لے کر اپنے کورس کی تکمیل اور جتنا کمی ہے پورا کر سکتے ہیں۔ تعلّم کا عمل گروہی طریقوں سے تیز ہو جاتا ہے۔ طلباء اپنے ساتھیوں سے زیادہ سیکھتے ہیں جب وہ ایک دوسرے سے کسی مضمون یا موضوع پر گفتگو کر رہے ہوتے ہیں تو وہ زیادہ سیکھتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ جو ایل اے سکھا رہا ہوگا وہ اس سے اتنا سیکھ پائیں گے جتنا ایک ماہر استاد سے مگر اس نے اگر اسی کورس میں اے لیا تھا تو وہ کم از کم اپنے ساتھی کو کچھ تو سکھا ہی پائے گا۔

دنیا اس وقت ہر نیا طریقہ استعمال کر رہی ہے کہ شاید اس سے بہتری ہو جائے یا دوسرے کسی طریقہ سے مزید مدد مل سکے۔ ہم صرف پاکستان میں ہی یکسانیّت کا شکار ہیں۔ بوسیدہ طرز تعلیم پر مصّر و جامد ہیں۔ یہ جدید تصوّرِ تعلیم تعلیمی مسائل کو حل کی طرف لے جانے میں معاونت کرے گا پاکستانی یونیورسٹیوں میں تعلیمی بحران کو حل کرنے میں مدد دیگا۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ ہوسکتا ہے ایک طالبِ علم پروفیسر کی بات سمجھ جائے اور دوسرا طالب علم، ایل اے یا ٹی اے کی بات سمجھ پائے۔ اس نظام کو لاگو کرنے کا اصل مقصد تعلیم کو سہل بنانا اور طالبعلموں کے لیے تحصیل علم زیادہ ذرائع فراہم کرنا ہے۔

کتابیات

خان عبداللہ چراغ، رسائلِ چراغ علی (حیدرآباد دکن) کتب خانہء آصفیہ، (1918)، 23-18

https://ur.wikipedia.org/wiki/چورا سانحہ چوری

علی مولوی چراغ، یورپ اور قرآن (1910)، کشور اسٹیم پریس (لاہور)، ص11

نقل مقدمہ بولیا حویلی بنام رضوان اللہ پسرم مولوی سبحان اللہ، 1919

https://indiankanoon.org/doc/243423/Equivalent citations:

J. Piggott, JUDGMENT 1 All 61 ILR (1919)

to Secretary Special, (H.D.) Department Home / M.S.A.

28 399, No. L. Official,-Demi India, of Government

7-1 pp. 1921, January

to Secretary Special, (H.D.) Department Home / M.S.A.

28 399, No. L. Official,-Demi India, of Government

7-1 pp. 1921, January

to Secretary Special, (H.D.) Department Home / M.S.A.

1921, pp. 1–7

سانحہ چورا چوری کا مکمل واقعہ تاریخی حوالہ کے ساتھ

http//:dart.columbia.edu/library/DART-0030/DART-0030.p

Meta, CIVIL REBELLION IN GORAKHPUR DURING THE REVOLT OF 1857Proceedings of the Indian History Congress, Vol. 50, Golden Jubilee Session) 1989(, pp. Indian History Congress 434-437) 4 pages

رسالہ تہذیب الاخلاق علیگڑھ، مطبوعہ شمارہ دسمبر 1984

Britannica, The Editors of Encyclopaedia. "Boundary Commission". Encyclopedia Britannica, 30 May. 2016, https//:www.britannica.com/topic/Boundary-Commission. Accessed 24 February 2022.

Leung, H. L.) 1979(. Redistribution of land values :A re-examination of the 1947 scheme. Cambridge :University of Cambridge, Dept. of Land Economy.

El-Hibri, T.) 2021(. The Abbasid Caliphate :A History. Cambridge :Cambridge University Press. doi:10.1017/9781316869567

https//:airchiefmarshals.blogspot.com/2007/10/bio-of-air-chief-marshal-retd-muhammad.html

https//:media.defense.gov/2018/May/23/2001922184-/1-/1/0/B_0136_CAUDILL_DEFENDING_AIR_BASES.PDF

https//:www.paknavy.gov.pk/professional_officer.html
https//:military-history.fandom.com/wiki/List_of_accidents_and_incidents_involving_military_aircraft_)1990%E2%80%9399
https//:defence.pk/pdf/threads/b-57-of-pakistan-air-force.710459-بی/57 کا 1969 کا حادثہ

The India–Pakistan War of1965 :A History , Dehradun and Delhi :Natraj Publishers, 2011, pp. 20–30.This book is an of?cial history of the war, brought out by the Ministry ofDefence, Government of India) GoI

Khan,The First Round Indo-Pakistan War 1965 , n. 28, p. 26.
https//:defence.pk/pdf/threads/b-57-the-intrepid-bomber-of-paf.396111/

"Case Concerning the Aerial Incident of 10 August 1999")PDF(. www.icj. Archived from the original) PDF (on 28 November 2007. Retrieved 19 July 2017

333 ASW squadron". www.paknavy.gov.pk. Archived from the original on 18 August 2016. Retrieved 26 December 2018.

"World Air Forces 1976". flightglobal.com. Archived from the original on 1 December 2017. Retrieved 24 November 2017

https//:ur.wikipedia.org/wiki سقوط بغداد /1258ء

Gazette Sadiq Al-Akhbar, Bahawalpur, 14 July, 1942

Khalid The Bahawalpur Perspective) Bahawalpur :

Government of the Punjab, 1974(, p.4. 3.

Rafiq, Mughal, Ancient Chjolistan) Rawalpindi :Feroze Sons. 1997(, p.20

Gillani, A.H.) 2014(. History of Bahawalpur State and its Culture.

www.nawaiwaqt.com.pk/31-Mar-2019/1000453 تمغہ امتیاز پاکستان

THE ISLAMIA UNIVERSITY
HAWALPUR

انجینئر پروفیسر ڈاکٹر اطہر محبوب (تمغۂ امتیاز)

وائس چانسلر۔ دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور

ڈائریکٹوریٹ آف کمیونٹی براڈکاسٹنگ ریڈیو، ٹی وی اینڈ فلم

دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور